اِنۡ اُرِیۡدُ اِلَّا الۡاِصۡلَاحَ مَا اسۡتَطَعۡتُ

جولائی ۲۰۲۱ء

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مُدیر: ڈاکٹر محمد امین

حافظ محمد موسیٰ بھٹو صاحب کی چند اہم کتابیں

۱۔ ملتِ اسلامیہ اور اس کی تعمیر کے صحیح خطوط
۲۔ جواہر حکمت و معرفت (ذاتی ڈائری کے اوراق سے)
۳۔ خزینہ شریعت و معرفت
۴۔ انسانی شخصیت میں نصب بت۔ روحانی اور نفسی بیماریوں کا تجزیہ
۵۔ نفسی قوتیں۔ جدیدیت کے پس منظر میں
۶۔ عالم اسلام، دجالی تہذیب کی زد میں
۷۔ مراقبہ اور زندگی کو بدلنے میں اس کا کردار
۸۔ جدید سندھ کے رجحانات
۹۔ اسلامی شریعت اور طریقت۔ حضرت مجددؒ کی نظر میں
۱۰۔ مسائل و معاملات میں حکیمانہ رہنمائی
۱۱۔ سندھ کے اکابر بزرگ شاعر اور ان کا پیغام
۱۲۔ تصوف و اہل تصوف، سلف و خلف کی نظر میں
۱۳۔ ندائے محبت
۱۴۔ ہمارے نفسی و اجتماعی مسائل
۱۵۔ اسلام پر اعتراضات کا علمی جائزہ
۱۶۔ معاشرہ کی اسلامی تشکیل نو اور تصوف و احسان
۱۷۔ شیخ ایاز کے آخری دس سال
۱۸۔ نفسی قوتیں، ایک مطالعہ۔ ایک جائزہ
۱۹۔ مشاہدۂ حق
۲۰۔ اسلامی فکر کی تشکیل اور معاشرے کی تعمیر
۲۱۔ عصر حاضر کے غلام مصطفیٰ ﷺ
۲۲۔ نفس اور مادیت کے خلاف معرکہ آرائی میں ذکر کا کردار
۲۳۔ عصر حاضر کی شخصیتیں۔ میری نظر میں (خطوط اور خاکے)
۲۴۔ تو اپنی خودی اگر نہ کھوتا
۲۵۔ صدائے محبت۔ (اہم خطوط کا مجموعہ)
۲۶۔ سندھ۔ ماضی، حال اور مستقبل (شخصیتوں کے آئینے میں)
۲۷۔ اسلامی فکر، بیسویں صدی میں
۲۸۔ تعلیمات مجدد الف ثانیؒ
۲۹۔ عرفان لطیف
۳۰۔ شاہ عبد اللطیف بھٹائیؒ کا پیام
۳۱۔ پیام۔ محبت (محمد موسیٰ بھٹو کے علمی اور دعوتی خطوط کا مجموعہ)
۳۲۔ اللہ کا پیغام انسانوں کے نام
۳۳۔ جدید سندھ کے دانشور اور عالم۔ تعارفی خاکے
۳۴۔ قرآن اور علم جدید (ڈاکٹر محمد رفیع الدین کے کتاب کی تلخیص)
۳۵۔ ملت اسلامیہ اور عصر حاضر کے تقاضے
۳۶۔ اصلاح نفس کا لائحہ عمل
۳۷۔ برصغیر ہند کی بعض ممتاز علمی شخصیتیں
۳۸۔ قومی تعمیر و زوال میں نظام تعلیم کا کردار
۳۹۔ اسلام اور ملت اسلامیہ۔ عہد جدید میں
۴۰۔ اسلام۔ مسلمان اور تہذیب جدید
۴۱۔ عہد جدید میں۔ داعی و صوفی کا کردار اور اس کی خصوصیات
۴۲۔ تعمیر سیرت کا کام اور اس کے تقاضے
۴۳۔ ہمارے سلگتے ہوئے اخلاقی و روحانی مسائل اور ان کا حل
۴۴۔ جدید انسان کا داخلی بحران۔ اور اس سے نکلنے کی صورت
۴۵۔ سلطان باہو کا کلام ترجمہ اور اس کی تشریح
۴۶۔ تصوف اور اسلامی تحریکیں۔ عہد جدید میں
۴۷۔ اہم تفسیری نکات۔ (اہل محبت و اہل سلوک کے لئے قرآنی لائحہ عمل)
۴۸۔ دینی جماعتوں و شخصیتوں کا علمی جائزہ
۴۹۔ مجالس نبوی ﷺ
۵۰۔ سلیقہ انسانیت کا بحران۔ اور بچاؤ کی تدابیر

سندھ نیشنل اکیڈمی ٹرسٹ

400بی، یونٹ نمبر 4 لطیف آباد، حیدرآباد (سندھ)

m.moosabhutto@gmail.com 022-3861864 0336-3039299

ڈاکٹر محمد امین کی تازہ تالیف

خاموش انقلاب ناگزیر ہے

ریاست اگر ساتھ نہ بھی دے تو انفرادی اور اجتماعی زندگی میں اسّی فیصد سے زیادہ اسلام پر عمل کیا جاسکتا ہے۔

صفحات ۲۸۸ قیمت ۲۵۰ روپے

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور

فون: 0309-4607124، ای میل ermpak@hotmail.com

ماہنامہ البرھان لاہور

جلد ۲۵، شمارہ ۷، جولائی ۲۰۲۱ء / ذوالقعدہ ۱۴۴۲ھ

مشمولات

○ تعلیم و تربیت

- تعلیمی اداروں میں اخلاقی تربیت کا فقدان — پروفیسر ملک محمد حسین — ۴
- نئی قومی تعلیمیڈ د پالیسی ۔ لبرلزم اور سیکولرزم کے نرغے میں — ۶

○ دینی مدارس

- فضل و کمال کی ساری جگہیں خالی ہیں — ڈاکٹر محمد اکرم ندوی — ۱۰
- دینی مدارس اور حکومت کا رویہ — ڈاکٹر محمد امین — ۱۴
- دینی مدارس کی ڈگریوں کے تسلیم نہ کیے جانے کا مسئلہ — ۱۵

○ اسلام اور پاکستان

- ایک نئے مشترکہ دینی پلیٹ فارم کی ضرورت — ڈاکٹر محمد امین — ۱۸
- بیانیے کی قوت اور اس کا فروغ و نفاذ — پروفیسر ملک محمد حسین — ۲۱

○ تزکیۂ نفس

- کیا آپ کا قلب بیمار ہے؟ — امام ابن قیم الجوزیہ — ۲۸
- ایک تھا لوہار — ادارہ — ۲۹

○ تفہیم مغرب

- مغربی مفکرین اور فلاسفہ کے افکار و آراء (۲) — ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری — ۳۱
- جدیدیت اور روایت ۔ قدیم بحث، عصری تناظر — وحید مراد — ۳۹

○ مطالعۂ کتاب

- البرہان جون ۲۰۲۱ء پر تبصرہ — سید خالد جامعی — ۴۸
- 'آداب اختلاف اور اتحادِ امت' از ڈاکٹر اختر حسین عزمی — ڈاکٹر انوار احمد بگوی — ۵۲

○ یاد رفتگان

- راہِ خلد بریں چلے ۔ علامہ محمد خلیل الرحمن قادریؒ — مدیر — ۵۵

○ استفسارات

- مولانا وحید الدین خاں کی فکر — مدیر — ۵۶

○ مطالعۂ کتب

- کتاب نما — مدیر — ۵۷

مدیر: ڈاکٹر محمد امین

نائب مدیر: پروفیسر ملک محمد حسین

انچارج سرکولیشن
(0309-4607124)
[برائے خریداری، تجدید، شمارہ تاخیر سے ملنے کی شکایت اور مکتبہ البرہان کی کتب کی خریداری کے لیے]

زرِ اعانت: فی شمارہ 45 روپے
سالانہ 500 روپے ۔ پانچ سال: 2000 روپے
تاحیات 10,000 روپے

تحریک اصلاحِ تعلیم ٹرسٹ
سونیری بنک لمیٹڈ، مین برانچ، لاہور
A/c # 02011478219

برائے رابطہ
97-A نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور 54700
ادارتی امور
ermpak@hotmail.com

برائے آن لائن مطالعہ
www.alburhanmonthly.org

کمپوزنگ: حافظ محسن یوسف
0306-4640366

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

تعلیمی اداروں میں اخلاقی تربیت کا فقدان

تعلیمی ادارے محض معلومات دینے کا وسیلہ بن گئے ہیں، اگرچہ یہ امر بھی قابل غور ہے کہ آیا تعلیمی ادارے معلومات اور صحیح معلومات دے بھی رہے ہیں یا نہیں؟ اکثر تو انفارمیشن کے نام پر ڈس انفارمیشن ہی دی جاتی ہے کیونکہ تعلیم بھی تہذیب مغرب کے فروغ کے لیے ایک ایجنٹ کا کام دے رہی ہے۔ سکول ایجوکیشن یا ہائر ایجوکیشن کا ریپر (Wraper) بھی مغربی ہے اور ریپر کے اندر کا مال بھی مغربی ہے۔ یہ تو خیر ایک پہلو ہے تعلیم کا جو اس وقت ہمارا موضوع نہیں ہے۔ ہمارا موضوع ہے تعلیم میں اور تعلیمی اداروں میں اخلاقی تربیت۔ تعلیم اگر دی بھی جا رہی ہے تو اخلاقی تربیت کا مکمل فقدان ہے۔ حتیٰ کہ وہ ادارے جو طلبہ کو دین کی تعلیم دیتے ہیں یعنی دینی مدارس، تو وہاں بھی سیرت و کردار کی تربیت تقریباً مفقود ہے۔ اگر ہم اس کمزوری کی وجہ جاننے کی کوشش کریں تو ہمیں دو وجوہات نظر آتی ہیں۔ پہلی اور سب سے بڑی وجہ تو یہ ہے کہ یہ عنصر ہی تعلیم کے عمل سے غائب ہے۔ اس کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ جن کے ہاتھوں میں تربیت کا عمل ہوتا ہے وہ ہاتھ ہی اس عمل کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ استاد کے لیے تربیت کرنے کی صلاحیت کا حامل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود سیرت و کردار کے ان تمام محاسن سے آراستہ ہو جو اس نے اپنے طلبہ میں منتقل کرنے ہیں۔ دوسرا اس کے اندر قائدانہ صلاحیت ہو کہ وہ اپنے شاگردوں کو عقیدت مندی کے ساتھ اپنے پیچھے لگا سکے۔ تیسرے اس کے اندر خود اعتمادی ہو۔ چوتھا یہ کہ اپنے شاگردوں کے لیے اس کے دل میں محبت، ہمدردی اور شفقت کے جذبات ہوں۔ دوسری طرف شاگردوں میں اپنے استاد کے لیے احترام، احسان مندی، اعتماد اور مکمل سرشاری کے جذبات ہوں۔ اب ہم آتے ہیں اس تعلیمی ماحول کی طرف جس میں اساتذہ اور طلبہ کام کرتے ہیں اور بات کرتے ہیں اس حیثیت کی جو استاد کو دی گئی ہے۔

تعلیمی ادارے میں استاد ملازم ہوتا ہے۔ پرائیویٹ اداروں میں تو استاد کی حیثیت تعلیمی

مزدور کی ہے۔ طلبہ چونکہ فیس دیتے ہیں لہٰذا ان کی حیثیت آجر کی ہے۔ سکول انتظامیہ یا اعلیٰ تعلیمی اداروں کی انتظامیہ اپنے تعلیمی کاروبار کے فروغ اور استحکام کے لیے مجبور ہے کہ طلبا کی خوشنودی اور ان کے والدین کی خوشنودی کو ملحوظ خاطر رکھے اور استاد کو بھی یہی ہدایت ہوتی ہے کہ طلبہ چونکہ کلائنٹ ہیں لہٰذا کلائنٹ ناراض نہیں ہونا چاہیے۔ تو جب استاد اور شاگرد کا رشتہ آجر اور اجیر کا یا گاہک اور دکاندار کا ہو گیا تو کہاں کی تربیت اور کہاں کی لیڈرشپ۔ ٹیوشن اکیڈمیاں تو بہر حال تعلیمی دکانیں ہیں اور ان سے تربیت کے کام کی توقع نہیں ہے۔

اب آتے ہیں سرکاری تعلیمی اداروں کی طرف۔ وہاں پر سول بیوروکریسی کا راج ہے اور وہاں پر استاد کی حیثیت تعلیمی مزدور سے بھی بدتر کر کے اسے تعلیمی غلام بنا دیا گیا ہے۔ استاد تو استاد تعلیمی ادارے کا سربراہ بھی بے وقعت ہے۔ مرکز میں اختیار کا منبع سیکرٹری ایجوکیشن یا بالفاظ دیگر سیکشن افسر ہے۔ ضلع میں اختیار کا منبع ڈپٹی کمشنر ہے۔ صوبے کا ڈائریکٹر پبلک انسٹرکشن، ڈویژن کا ڈائریکٹر اور ضلع کا ایجوکیشن اتھارٹی کا چیف ایگزیکٹو آفیسر محض کلرک ہیں اور ان کے کلرک اساتذہ کرام کے حقیقی افسر ہیں۔ اساتذہ کی چیکنگ کے لیے فورسز کے ریٹائرڈ اہل کار بھرتی کیے گئے ہیں۔ اساتذہ کی اپنی بھرتی سیاسی بنیادوں پر اور رشوت دے کر انجام پاتی ہے۔ اس کیفیت میں استاد سے سیرت و کردار کی تربیت کی توقع رکھنا کیسے ممکن ہے۔ اگر ہم تعلیم کے عمل میں تربیت کے عنصر کو اہمیت دینا چاہتے ہیں تو اساتذہ کی توقیر یقینی بنانا ہوگی۔ انہیں تعلیمی مزدور سے اٹھا کر صاحب علم قائد کی حیثیت دینا ہوگی۔ انہیں بااختیار بنانا ہوگا۔ اور ان کے سر سے کلیریکل اور بیوروکریٹ کا ڈنڈا اٹھانا ہوگا۔ ایک صاحب علم، آزاد ذہن، پُراعتماد شخص اور قائدانہ صلاحیتوں کا حامل معلم ہی اپنے طلبہ کی اخلاقی تربیت کر سکتا ہے۔

تعلیم و تربیت پروفیسر ملک محمد حسین

نئی قومی تعلیمی پالیسی- لبرلزم اور سیکولرزم کے نرغے میں

تعلیمی پالیسی کی تشکیل وتدوین ایک سنجیدہ قومی مسئلہ ہے جس کے لیے وسیع تر مشاورت، نہایت تجربہ کار ماہرین تعلیم، قوم کے ماضی اور مستقبل پر نظر رکھنے والے دانشور، قومی تہذیب وثقافت اور نظریۂ حیات کے گہرے فہم کے حامل دردمند رجالِ کار اور تاریخ وادب سے واقف علمائے دانش کے ساتھ قوم کی کشتی کو سلامتی سے لے کر چلنے والے سیاسی وانتظامی ماہرین کا مل کر کام کرنا ضروری ہوتا ہے۔ وطن عزیز میں کئی تعلیمی پالیسیاں تشکیل دی گئیں لیکن پاکستان کے معرضِ وجود میں آنے کے فوراً بعد تیار کی جانے والی پہلی تعلیمی پالیسی اور جنرل ضیاء الحق کے دورِ حکومت میں بنائی جانے والی ۱۹۷۸ء کی تعلیمی پالیسی قومی امنگوں اور مستقبل کے وژن پر مبنی بہترین تعلیمی پالیسیاں شمار ہوتی ہیں کیونکہ دونوں تعلیمی پالیسیوں کے تیار کرنے میں ان امور کا خیال رکھا گیا جن کا سطور بالا میں ذکر ہوا ہے۔

تعلیمی پالیسی کی بنیاد قوم کا نظریۂ حیات ہوتا ہے۔ پاکستانی قوم کا نظریۂ حیات اسلام ہے۔ قومی نظریۂ حیات کی روشنی میں قوم کا آئین یا دستور بنایا جاتا ہے جو دیگر تمام پالیسیوں کے ساتھ تعلیمی پالیسی کے لیے بھی ایک فریم ورک مہیا کرتا ہے۔ قوم کی ضروریات کا تعین کیا جاتا ہے۔ موجود کیفیت کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ ماضی کی پالیسیوں کے تجزیہ کے ساتھ ان کی کامیابیوں، مشکلات اور باقی رہ جانے والے خلاء کا مطالعہ کیا جاتا ہے۔ قومی سطح پر وسیع تر مشاورت کے لیے ہر طبقہ زندگی سے لیے گئے افراد پر مشتمل قومی تعلیمی کانفرنس کا انعقاد کرکے بنیادی پالیسی امور کا تعین کیا جاتا ہے اور آخر میں ماہرین کے پینل بنا کر قومی تعلیمی پالیسی کا مسودہ تیار کیا جاتا ہے۔ اس طرح تیار کیا گیا مسودہ قومی سطح پر تنقید وتبصرہ کے لیے مشتہر کیا جاتا ہے اور لوگوں کی وسیع تر آراء کی روشنی میں تعلیمی پالیسی کا حتمی مسودہ تیار کرکے منظوری کے لیے پارلیمنٹ میں پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں قوم کے منتخب نمائندے قومی نظریۂ حیات، آئین اور مستقبل کی آورشوں کی روشنی میں اس کا جائزہ لیتے ہیں اور بحث وتمحیص کے بعد قومی تعلیمی پالیسی کو حتمی شکل میں منظور کرتے ہیں۔

سطور بالا میں کی گئی تمہیدی گفتگو کے بعد ہم عمران خاں حکومت کے ان اقدامات کی طرف آتے ہیں جو وہ قومی تعلیمی پالیسی کی تشکیل نو کے لیے کر رہی ہے۔ غالباً دسمبر یا جنوری ۲۰۲۱ء میں اعلان کیا گیا کہ قومی تعلیمی پالیسی کا مسودہ تیار کیا جا رہا ہے جو فروری کے پہلے ہفتے میں قوم کے سامنے رکھا جائے گا اور اس پر بحث ومباحثہ کے بعد آخری شکل میں ۲۳ مارچ ۲۰۲۱ء کو نافذ کر دیا جائے گا۔ اس اعلان کے بعد خاموشی طاری رہی۔ ۲۳ مارچ کو کسی پالیسی کے نفاذ کا اعلان نہ آیا اور اب وزارت وفاقی تعلیم اسلام آباد کی طرف سے ۲۳ ماہرین کی ایک فہرست کا اعلان ہوا ہے جو بعض دیے گئے ایشوز پر تعلیمی پالیسی تیار کریں گے۔ ہم نے آغاز میں تعلیمی پالیسی کی تشکیل وتدوین کے لیے جن امور کا ذکر کیا تھا ان میں کسی امر کو درخورِ اعتنا نہیں سمجھا گیا۔ تعلیمی پالیسی میں پہلا قدم وژن، مشن، اہداف اور قومی مقاصدِ تعلیم کا تعین ہوتا ہے۔ اس کے بعد ثانوی تعلیم، اعلیٰ تعلیم، ٹیکنیکل تعلیم، سائنس کی تعلیم، اسلامیات کی تعلیم، تعلیم اساتذہ، بہبود اساتذہ، بہبود طلبہ، انتظام وانصرام تعلیم وغیرہ اس طرح کے بنیادی موضوعات کو لے کر پالیسی میں ان کی موجودہ صورتِ حال، مستقبل کے اہداف، اہداف حاصل کرنے کی حکمت عملی کا ذکر ہوتا ہے لیکن موجودہ حکومت نے اس تکلف میں پڑے بغیر کچھ عجیب وغریب ایشوز لے کر ان ایشوز کے لیے پالیسی وضع کرنے کے لیے ایک یا دو نام نہاد ماہرین کا تعین کر دیا ہے مثلاً Out of School Children کے ایشو پر صادقہ صلاح الدین، صوفیہ صدیقی، مدیحہ انصاری اور عابد گل کام کریں گے۔ Retention of Enrolled Children کے اشو پر ڈاکٹر طاہر اندرابی، اور گلاب خان کام کریں گے۔ سنگل نیشنل کریکولم پر ڈاکٹر مریم چغتائی کام کریں گی اور علیٰ ہذا القیاس ۲۳ ایشوز لیے گئے ہیں جن پر کہیں ایک ایکسپرٹ اور کہیں ایک سے زیادہ ایکسپرٹ کے کام کرنے کا عندیہ دیا گیا ہے۔ ۲۳ ماہرین جن کو اس کام پر لگایا گیا ہے وہ لاہور یونیورسٹی آف مینجمنٹ، سائنسز (LUMS)، آغا خان یونیورسٹی، حبیب یونیورسٹی کراچی اور زیادہ تر غیر معروف این جی اوز کے کرتا دھرتا ہیں۔ سب لوگ جو لیے گئے ہیں وہ لبرل، سیکولر اور نظریۂ پاکستان کی مخالف لابی کے لوگ ہیں۔ زیادہ تر ترقی پسند خواتین ہیں اور کوئی ایک نام بھی ایسا نہیں ہے جو پاکستان میں تعلیم کے شعبہ کا معروف نام ہو۔ وطن عزیز میں ماہرین تعلیم کی کمی نہیں۔ نامور ادارے موجود ہیں اور اگر این جی اوز سے ہی لوگ لینا تھے تو ملک میں ایسی نامور این جی اوز موجود ہیں جن کا تعلیم میں

قابل قدر کام ہے۔ پبلک سیکٹر میں پنجاب یونیورسٹی کا ادارہ تعلیم وتحقیق، پشاور یونیورسٹی، گومل یونیورسٹی، سندھ یونیورسٹی، کوئٹہ یونیورسٹی کے ادارہ ہائے تعلیم وتحقیق، اورخود وفاقی اورصوبائی حکومتوں کے تحت کام کرنے والے معروف ادارے، ریٹائرڈ ماہرین تعلیم، شاعر، ادیب، دانشور، تعلیم کے ایشوز پر نظر رکھنے والے درجنوں صحافی اور ماہرین کی ایک کہکشاں ہے جو ملک میں موجود ہے لیکن وزارت وفاقی تعلیم خصوصاً جناب شفقت محمود وفاقی وزیر تعلیم کولمز (LUMS)، آغا خان اور چند گمنام این جی اوز جن کے کرتا دھرتا لبرل، سیکولر، دین بیزار اور مغربی فکر کے دلدادہ لوگ ہیں کے علاوہ پورے ملک میں قومی تعلیمی پالیسی کی تشکیل کے لیے کوئی محب وطن، محب اسلام، ماہر تعلیم نہیں سوجھا۔ ایک طرف خود وزیر اعظم جناب عمران خان ریاست مدینہ کا نعرہ لگاتے ہیں۔ سکولوں میں سیرت طیبہ کی تعلیم کو لازمی قرار دینے کی بات کرتے ہیں۔ ملک میں اسلام کا بول بالا چاہتے ہیں اور دوسری طرف ان کے چہیتے وزیر تعلیم شفقت محمود ہیں جو تعلیم کے ذریعے لبرلزم، سیکولرزم، ہیومنزم اور مغربی فکر وتہذیب میں ڈوبی ہوئی تعلیم کا فروغ چاہتے ہیں۔ اس سے پہلے قومی نصاب تعلیم کی تشکیل کے لیے جو نیشنل کریکولم کونسل بنائی گئی اس میں بھی یہی سیکولر لبرل لابی کے لوگ چھائے ہوئے تھے اور اب قومی تعلیمی پالیسی کی تدوین کے لیے بھی انہی لبرل، سیکولر لوگوں کو ذمہ داری دی گئی ہے اور محب وطن، محب اسلام ماہرین تعلیم کو پہلے نیشنل کریکولم کونسل کے بھی قریب پھٹکنے نہیں دیا گیا تھا اور اب قومی تعلیمی پالیسی بنانے والے ماہرین کی ٹیم کو بھی ان سے پاک رکھا گیا ہے۔

ہم یہ بات واضح کر دینا چاہتے ہیں کہ قوم کوئی ایسی قوم تعلیمی پالیسی قبول نہیں کرے گی جس کی بنیاد اسلام، نظریۂ پاکستان اور آئین پاکستان نہ ہو۔ قوم تعلیمی شعبے کو ان لبرل سیکولر کھلنڈروں کے ہاتھوں تباہ ہونے کی اجازت نہیں دے گی۔ یہی لبرل سیکولر لابی پہلے سنگل نیشنل کریکولم کو سیکولرائز کرنے کی ذمہ دار ہے اور پھر یہی لابی اسلامیات اور قرآن کی تدریس کے خلاف اخباروں میں مضامین لکھتی رہی ہے اور نصاب میں رہے سہے اسلام کو بھی نکلوانے کی جدوجہد کرتی رہی ہے اور اب اسی لابی کے لوگ قومی تعلیمی پالیسی کا تیاپانچا کرنے کے لیے آگے لائے جارہے ہیں۔ ایسا دکھائی دیتا ہے کہ جناب شفقت محمود جو معروف لبرل سیکولر بیوروکریٹ ہیں ایک سوچی سمجھی پالیسی کے تحت تعلیم کی فیصلہ سازی لبرل سیکولر لابی کے لوگوں کے ہاتھ میں دیتے ہیں اور

مجبوری کے تحت جتنا کچھ اسلامی پہلو تعلیم، نصاب وغیرہ کے اندر رہ جاتا ہے اس کے خلاف پھر اسی لابی کے لکھاریوں کے ذریعے اخبارات اور میڈیا میں اس کے خلاف مہیم چلاتے ہیں۔ محب وطن، محبت اسلام لوگوں، خاص طور پر علمائے کرام، اساتذہ، صحافی حضرات اور دینی سیاسی حلقوں کو متحد ہو کر اس تعلیمی شر پسندی کی مزاحمت کرنی چاہیے اور ملک کے نظریاتی تشخص کو مجروح ہونے سے بچانے کے لیے مسلسل جدوجہد کرنی چاہیے۔

ایک مشترکہ فورم کی ضرورت

وطن عزیز میں اس وقت نظریاتی سطح پر بہت سخت کشمکش جاری ہے۔ سیکولر لبرل لابی متحد بھی ہے، فعال بھی ہے اور ان کی پشت پر اندرون ملک اور خاص طور پر بیرون ملک سے معقول پشت پناہی بھی حاصل ہے۔ امریکہ، برطانیہ، جرمنی اور دیگر یورپی ممالک نے اس مقصد کے لیے سپیشل ادارے بنا رکھے ہیں جو اسلامی ممالک میں عموماً اور پاکستان میں خصوصاً سیکولر لبرل لابی کی مدد و معاونت پر کمر بستہ رہتے ہیں۔ فنڈز کی کوئی کمی نہیں۔ پاکستان میں لبرلزم سیکولرزم کے فروغ کے لیے پیسہ پانی کی طرح بہایا جاتا ہے۔ خصوصی ہدف تعلیم کا شعبہ، آزادئ نسواں اور اباحیت و برہنگی کا فروغ ہے۔

دوسری طرف محب وطن، محب اسلام اور شرافت پر مبنی کلچر کو فروغ دینے والی لابی کے لوگ ہیں جو اگرچہ کثیر تعداد میں ہیں۔ ایسے درجنوں ادارے اور تنظیمیں ہیں جو لبرل سیکولر طوفان کے سامنے بند باندھنے کے لیے بے چین رہتے ہیں لیکن غیر مؤثر ہیں۔ مختصراً شر کی قوتیں تھوڑی لیکن متحد ہیں، متحرک ہیں اور جوش و جذبہ سے سرشار ہیں دوسری طرف خیر کی قوتیں کثیر ہیں لیکن جمود، ڈیپریشن اور تنہائی کا شکار ہیں۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ان منتشر لوگوں، اداروں اور تنظیموں کو ایک متحدہ پلیٹ فارم پر لا کر مؤثر قوت بنایا جائے۔ ان میں تحرک، جوش و جذبہ اور بروقت اقدام کے لیے تیار رہنے کا احساس و ادراک پیدا کیا جائے۔ گزشتہ صفحات میں ہم نے تعلیم کے شعبہ میں ہونے والے جس ڈاکے کا ذکر کیا ہے اس کا حل بھی مثبت قوتوں کا یہی متحدہ پلیٹ فارم ہے۔ ہم اپنے قارئین کے لیے یہ ڈھیلی ڈھالی تجویز دیکر ان کی طرف سے اسے مزید نکھارنے کا انتظار کریں گے۔

دینی مدارس

ڈاکٹر محمد اکرم ندوی [۱]

فضل وکمال کی ساری جگہیں خالی ہیں

مدارس کے طلبہ اور نوجوان فارغین توجہ فرمائیں

مدرسوں کے طلبہ اور فارغین اپنے مستقبل کے متعلق فکر مند رہتے ہیں۔ وہ شکایت کرتے ہیں کہ وہ جگہیں بہت محدود ہیں جہاں وہ عملی زندگی میں مشغول ہو سکتے ہیں، دینی تعلیم نے ان کے سامنے ترقی کی راہیں مسدود کر دی ہیں۔ ان کو مشورے دینے والے بھی ان کی تشویش بڑھاتے رہتے ہیں۔

اس مضمون میں اسی کی وضاحت کی جارہی ہے کہ وہ جگہیں جنہیں آپ اپنا میدان عمل بنا سکتے ہیں، وہ ہرگز محدود نہیں، بلکہ صحیح بات یہ ہے کہ ان جگہوں پر کوئی مقابلہ ہی نہیں۔ مواقع کے کمی کی شکایت اس لیے ہے کہ آپ غلط جگہوں پر نگاہ لگائے ہوئے ہیں، آپ کی جگہ فضل وکمال ہے، آپ فضل وکمال کو چھوڑ کر ان جگہوں کو اپنا میدان سمجھ رہے ہیں جو آپ کے مقام سے فروتر ہیں۔ پہلے میں ان غلط جگہوں کی نشاندہی کرتا ہوں جنہوں نے آپ کے امکانات کو محدود کر دیا ہے۔ اور آپ کے سامنے ترقی کی راہیں مسدود کر دی ہیں، اس کے بعد فضل وکمال کے ان لامتناہی مواقع کی وضاحت کی جائے گی جن سے آپ نے آنکھیں بند کر لی ہیں۔

غلط مواقع

ذیل میں بطور مثال ان چند چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جنہوں نے آپ کے امکانات کو محدود کر دیا ہے، اور آپ کی صلاحیتوں کو برباد کر دیا ہے:

۱۔ مدرسوں کے فارغین کی ایک بڑی تعداد ایک نئے مدرسہ یا ادارہ کے قیام کو اپنا مطمح نظر بنا لیتی ہے۔ اس طرح وہ اپنا شغل تلاش کر لیتے ہیں، اور اپنا معاشی مسئلہ بھی حل کر لیتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ فارغین کی تعداد بہت بڑی ہے، سب کے لیے کوئی نیا مدرسہ یا ادارہ بنانا ناممکن ہے۔ آپ جب بھی تعلیم کا مقصد کسی ادارہ کی تاسیس سمجھیں گے آپ پریشانی میں رہیں گے اور فارغین مدارس کے مسائل کبھی حل نہیں ہوں گے۔

---

[۱] ڈائریکٹر آکسفورڈ اسلامک سنٹر، برطانیہ

کسی مدرسہ یا ادارہ کی تعمیر ایک غلط سوچ ہے۔ نئے مدرسوں اور اداروں کی کوئی ضرورت نہیں، اور اگر ضرورت ہو بھی تو اس کے لیے دوسرے لوگ موجود ہیں، کوئی مدرسہ یا ادارہ بنانے کے لیے عالم ہونا ضروری نہیں۔ اسلامی تاریخ میں بالعموم مدرسے ان مردوں اور خواتین نے بنائے ہیں جو خود عالم نہیں تھے، مدرسہ بنانے کے وسائل آپ کے پاس نہیں ہیں، آپ چندہ مانگنے پر مجبور ہوں گے، جو ایک ذلت آمیز کام ہے۔ اگر آپ نے چندہ سے مدرسہ بنا لیا تو پھر اسے چلائیں گے کیسے؟ اس کے لیے بھی چندہ جمع کرنا ہوگا، اور یوں پوری زندگی چندہ کی نذر ہو جائے، اور جب آپ اتنی محنت کریں گے تو سوچیں گے کہ اس مدرسہ پر آپ کا اور آپ کی آئندہ نسلوں کا قبضہ برقرار رہے، جو لوگ بھی اس کام میں لگیں گے وہ فضل وکمال کی راہ سے دور ہو جائیں گے، ان کی صلاحیتیں مدرسوں کے بنانے میں ضائع ہو جائیں گی۔

۲۔ کچھ لوگ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ کسی مدرسہ یا ادارہ کے مہتمم، ناظم یا صدر بن جائیں، انتظامی عہدے محدود ہوتے ہیں، ان کے حصول کے لیے مقابلہ ہوگا، رسہ کشی ہوگی، عداوت ونفرت بڑھے گی، نتیجتاً فضل وکمال کے حصول کے بغیر زندگی ختم ہو جائے گی۔

۳۔ کچھ لوگ کسی مخصوص مدرسہ یا ادارہ میں کام کرنے کے لیے مصر ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی مدرسہ یا ادارہ صرف محدود لوگوں کی تقرری کر سکتا ہے، اکثریت محرومی کا شکار رہے گی۔

۴۔ آج کل مدارس کے فارغین کی بڑی تعداد انگریزی زبان یا کمپیوٹنگ وغیرہ میں ایک دو سالہ کورس کر کے کوئی نہ کام تلاش کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ اس سے ان کا معاشی مسئلہ کسی حد تک حل ہو جاتا ہے، لیکن وہ فضل وکمال سے محروم ہو جاتے ہیں، اور مدارس میں علوم وفنون کی تحصیل میں جو محنت کی ہے وہ ضائع ہو جاتی ہے۔

درست مواقع

درست مواقع دو ہیں جو لامحدود ہیں اور ان میں مدارس کے سارے فارغین لگ سکتے ہیں۔ نہ کوئی مقابلہ آرائی اور نہ حسد وعداوت۔ اور حقیقتاً یہی دونوں جگہیں آپ کا جوہر دکھانے کی جگہیں ہیں، ایک فضل، دوسرا کمال۔

انسانی فضائل میں آپ آگے بڑھیں۔ انسانی فضائل وہ صفات ہیں جو انسان کو مزین کرتی

ہیں اور انہی صفات کا پیدا کرنا مقصد تخلیق ہے۔ یہ صفات ہیں: ایمان، اسلام، عبادت، تقوی، امانت، عدل، کرم، صبر، حلم، عفو، قربانی۔ ان صفات کو آپ اپنائیں گے تو خدا سے قریب ہوں گے، آخرت میں آپ کی نجات کی امید قوی تر ہوگی، آپ کی محبوبیت دلوں میں ڈال دی جائے گی، اور یہ وہ صفات ہیں جو دنیا کے فساد کو ختم کرنے کی ضامن ہیں، آج نہ علماء میں ان صفات کے حاملین ہیں، نہ غیر علماء میں۔

دوسری چیز ہے کمال۔ آپ نے جو مضامین پڑھے ہیں ان میں سے کسی ایک میں کمال پیدا کریں۔ کمال کی ساری جگہیں خالی ہیں، صاحب کمال کہیں ہو دنیا اس کی قدر کرے گی، اسے سروں پر بٹھائے گی۔ ذیل میں وہ چند موضوعات ذکر کیے جاتے ہیں جن میں آپ کمال پیدا کر سکتے ہیں:

۱۔ تفسیر وعلوم قرآن ۲۔ حدیث وعلوم حدیث

۳۔ فقہ، اصول فقہ، فتوی وغیرہ ۴۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت

۵۔ عام سیرت وسوانح ۶۔ تاریخ اسلام

۷۔ علم کلام، یعنی ادیان وفرق کے بنیادی مسائل اور عقائد وافکار کو متاثر کرنے والے نظریات کا مطالعہ۔ ۸۔ اسلام اور جدید علوم: معاشیات اور اسلام، ماحولیات اور اسلام، نفسیات اور اسلام، جدید طب اور اسلام، وغیرہ۔

۹۔ اردو زبان وادب ۱۰۔ عربی زبان وادب

معاشی مسئلہ کا حل

آپ سوال کریں گے کہ فضل وکمال کی تحصیل سے ہمارا معاشی مسئلہ کیسے حل ہوگا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ فضل وکمال کی تحصیل مجاہدہ ہے۔ اس میں بڑی قربانیاں دینی پڑتی ہیں۔ آپ مردانگی کے ساتھ اس وقت تک استقامت اختیار کریں جب تک کہ مطلوب کے قریب نہ پہنچ جائیں۔ جب آپ مطلوب کے قریب پہنچ جائیں تو آپ کا فضل وکمال خود بولے گا۔ دنیا آپ کو تلاش کرے گی اور آپ کے لیے بڑی بڑی پیشکش کرے گی۔

چند مثالیں پیش کرتا ہوں:

قاری ابوالحسن جگدیشپوری نے اپنے فن میں کمال پیدا کیا تو دیوبند نے انہیں خود دعوت دی اور ان کی تقرری کی۔ مولانا عبدالحق اعظمی صاحب نے حدیث میں امتیاز پیدا کیا تو انہیں بلا کر دیوبند میں حدیث کا استاد بنا دیا گیا، سابق مہتمم دارالعلوم قاری طیب صاحب، شیخ الحدیث مولانا زکریا، مولانا حبیب الرحمن اعظمی وغیرہ کو مختلف باعزت پیشکشیں کی گئیں۔

مولانا برہان الدین سنبھلی دلی کی فتحپوری مسجد میں درس قرآن دیتے تھے۔ ان کے کمال کا علم ہوا تو مفکر اسلام مولانا سید ابوالحسن علی ندویؒ نے انہیں ندوہ میں مدرس بنا دیا، جہاں وہ ایک کامیاب استاد کی حیثیت سے درس وتدریس میں مشغول رہے۔ مولانا واضح رشید ندوی نے عربی زبان وادب میں کمال پیدا کیا تو ان کو ندوہ بلایا گیا، مدرس بنایا گیا اور الرائد کی ایڈیٹنگ ان کے سپرد ہوئی۔

دنیا کے سارے ادارے شکایت کر رہے ہیں کہ انہیں اصحاب کمال نہیں مل رہے ہیں۔ حد یہ ہے کہ دارالعلوم دیوبند جہاں محدثین پیدا ہوتے تھے اب اس مرکز حدیث کو باکمال محدثین کی تلاش ہے۔

آج کل جو لوگ مدارس سے فارغ ہو رہے ہیں ان کا معیار بہت پست ہے، نہ کوئی زبان آتی ہے، اور نہ علوم وفنون میں کوئی دسترس۔ اور خواہش یہ کہ ان کو غزالی ورازی کا مقام ملے۔ جان لیں کہ آرزوؤں سے کوئی مقام نہیں ملتا۔ پست معیار کی دنیا میں کوئی قدر نہیں۔ تفوق وامتیاز پیدا کریں۔ امتیاز کی ساری جگہیں خالی ہیں۔ سستی اور کاہلی سے پرہیز کریں۔ شکایتوں سے بچیں، ہمت وحوصلہ بلند کریں اور فضل وکمال کی چوٹی کو اپنا نشیمن بنائیں۔

[redacted]

بدقسمتی سے لاہور کے ایک بڑے مدرسہ کے عالم دین عملِ قوم لوط میں ملوث ہونے کی بناء پر پکڑے گئے۔ معاملہ سوشل میڈیا پر آیا اور دین بیزار، سیکولر اور لبرل لوگوں کے لیے علماء ومدارس کے تمسخر واستہزاء کا سبب بنا۔ ہم سمجھتے ہیں کہ وفاق المدارس العربیہ اور دینی قوتوں کو اس پر خاموش رہنے کی بجائے اس کی کھل کر مذمت کرنی چاہیے۔ مدارس کے اخلاقی انحطاط کا فسانہ اگر عام ہو گیا تو دینی مدارس کو شدید نقصان پہنچے گا لہٰذا اسے صرف ایک انفرادی واقعہ نہیں سمجھنا چاہیے بلکہ دینی مدارس کے وفاقوں کو اساتذہ اور طلبہ کی اسلامی تربیت اور احتساب کا باقاعدہ نظام قائم کرنا چاہیے اور اسے فعال رکھنا چاہیے۔

دینی مدارس مدیر

دینی مدارس اور حکومت کا رویہ

دینی مدارس اور ان کے وفاق غور فرمائیں

۱۔ حکومت نے یکساں نظام تعلیم کا ڈول ڈالا اور اس میں وفاقوں کے نمائندوں کو صرف اسلامیات کی نصاب سازی میں شامل کیا۔ باقی مضامین میں اسلام کی بجائے مغربی فکر و تہذیب خصوصاً ہیومنزم کی اقدار کو سمونے کی کوشش کی۔ ابھی چونکہ پرائمری اور مڈل سکول کی بات ہو رہی ہے اس لیے مدارس نے اس کی آنچ کو محسوس نہیں کیا جب بات میٹرک اور ایف اے کے یکساں نصاب تک پہنچے گی اور مدارس کا ثانویہ عامہ و خاصہ ختم ہوگا پھر انہیں ہوش آئے گا۔

۲۔ ہائر ایجوکیشن کمشن نے بی اے اور ایم اے کے امتحانات کو ختم کر دیے ہیں اور ان کی بجائے ایسوسی ایٹ ڈگری پروگرام اور بی ایس شروع کر دیا ہے اور ان میں سے کوئی امتحان بھی پرائیویٹ طور پر نہیں دیا جا سکتا۔ گویا مدارس کی عالیہ کی سند جو ایم اے اسلامیات و عربی کے مساوی تھی، وہ بھی ختم اور بعض مضامین کے ساتھ عالیہ کی سند بی اے کے مساوی تھی، وہ بھی ختم۔

۳۔ پھر اوقاف ایکٹ مرکز کے ساتھ صوبوں میں بھی پاس ہو کر نافذ ہو گئے ہیں۔ کسی نے علماء سے پوچھا تک نہیں۔ یہ قوانین مساجد اور مدارس کے خاتمے کی کنجی ہیں۔

۴۔ حکومت نے دینی تعلیم کے دس نئے وفاق منظور کر دیئے تاکہ پرانے وفاقوں کی حیثیت ختم کر ہو جائے۔

۵۔ سول حکومت تو یہ سب کر ہی رہی تھی۔ رہی سہی کسر آرمی چیف صاحب نے پوری کر دی کہ سب مدارس والوں کو بلایا اور سمجھایا کہ ''سدھر جاؤ ورنہ....'' اور مدارس پر دباؤ ڈالا کہ وہ میٹرک اور ایف اے کے امتحان فیڈرل بورڈ سے دلوائیں۔

ہم دینی قوتوں اور خصوصاً دینی مدارس اور ان کے وفاقوں سے پوچھتے ہیں کہ کیا انہوں نے کبھی غور کیا ہے کہ یہ سب کیا ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے؟ حضرات! یہ سب کچھ دینی مدارس کو غیر مؤثر اور ختم کرنے کے لیے کیا جا رہا ہے۔

اے علماء کرام! اس صورتِ حال کا مقابلہ کرنے کے لیے آپ نے کیا کیا ہے؟ آپ کی حکمت عملی اور لائحہ عمل کیا ہے؟ کیا آپ متحد ہیں؟ کیا آپ کی ایک آواز ہے؟ کیا آپ نے دستور پاکستان کے اندر رہ کر حکومتی اقدامات کی مزاحمت کا کوئی پلان بنایا ہے؟ ایسا نہ ہو آپ سوتے ہی رہ جائیں اور چڑیاں چگ جائیں کھیت!

دینی مدارس مدیر

دینی مدارس اوران کے وفاق توجہ فرمائیں

دینی مدارس کی ڈگریوں کے تسلیم نہ کیے جانے کا مسئلہ

گھمبیر صورت اختیار کر چکا ہے لیکن مدارس اوران کے وفاق خاموش بیٹھے ہیں

حکومت اور پرانے پانچ وفاقوں کی تنظیم ''اتحاد تنظیمات مدارس اسلامیہ'' کے درمیان ڈیڈلاک دو مسائل کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ایک رجسٹریشن کی وجہ سے اور دوسرے حکومت ان کو مجبور کر رہی تھی کہ وہ میٹرک اور ایف اے کے امتحان فیڈرل بورڈ سے دلوائیں اور جدید تعلیم کا یکساں نصاب تعلیم اپنے ہاں نافذ کریں۔اب حکومت نے حال ہی میں ایک اور مسئلہ کھڑا کر دیا ہے اور لطف کی بات یہ ہے کہ دینی مدارس اوران کے وفاقوں سے اس سلسلے میں بات کرنے کی ضرورت ہی نہیں سمجھی۔وہ مسئلہ یہ ہے کہ حکومتی ادارے ہائر ایجوکیشن کمشن (ایچ ای سی HEC) نے دو سالہ بی اے اور دو سالہ ایم اے ختم کر دیا ہے اوراس کی جگہ اعلیٰ ثانوی (ایف اے، ایف ایس سی) کے بعد ایسوسی ایٹ ڈگری اور چار سالہ بی ایس نافذ کر دیا ہے جو پرائیویٹ نہیں ہوسکتے۔اس چار سالہ بی ایس میں تخصص کوئی بھی ہوسکتا ہے، اسلامیات کا بھی ہوسکتا ہے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اب دینی مدارس کی عالمیہ کی ڈگری کا ایم اے علوم اسلامیہ وعربی کے برابر ہونے کا اور عالیہ کی ڈگری (بعض شرائط کے ساتھ) بی اے کے مساوی ہونے کا مسئلہ ختم ہو گیا کہ جب بی اے اور ایم اے ہی نہیں رہا تو کوئی ڈگری ان کے مساوی کیسے ہوسکتی ہے؟ یہ بھی ذہن میں رہے کہ دینی مدارس کی ثانویہ عامہ وثانویہ خاصہ کی ڈگریاں پہلے ہی حکومت سے منظور شدہ نہیں تھیں بلکہ حکومت مدارس کو مجبور کر رہی تھی کہ ان کے طلبہ میٹرک اور ایف اے کے امتحانات حکومتی فیڈرل بورڈ سے دلوائیں۔رجسٹریشن اور انہی معاملات پر دینی مدارس کے پرانے پانچ وفاقوں اور حکومت میں ڈیڈلاک ہو گیا اور حکومت نے اس مزاحمت سے تنگ آ کر دس مزید وفاق منظور کر لیے لیکن مسئلہ ابھی تک جوں کا توں ہے۔جس کی وجہ غالباً یہ ہے کہ حکومت پرانے وفاقوں کی کھلم کھلا مزاحمت سے بچنا چاہتی ہے کیونکہ سب سے بڑا وفاق (وفاق المدارس العربیہ) دیوبندی مدارس کا

ہے جس کے رابطے مولانا فضل الرحمن سے ہیں جو موجودہ حکومت کی سیاسی سطح پر شدید مخالفت کررہے ہیں اور وفاق المدارس کو خطرے میں دیکھ کر وہ اسے ایشو بنالیں گے اور مدارس کو حکومت کے خلاف متحرک کرنے کا جواز پیدا ہوجائے گا اور یوں حکومت کو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔ پرانے پانچ وفاقوں کی فیڈریشن ''اتحاد تنظیمات مدارس اسلامیہ'' نے بھی چپ سادھ رکھی ہے۔ اندر خانے حکومت سے تھوڑے بہت مذاکرات چلتے رہتے ہیں لیکن ڈیڈلاک برقرار ہے۔

سوال یہ ہے کہ دینی مدارس کی تعلیم کا اور ان کی ڈگریوں کو تسلیم کرنے کے معاملے کا حل کیا ہے؟ اور اس حل تک کیسے پہنچا جاسکتا ہے؟ اس سلسلے میں ہماری رائے درج ذیل ہے:

دینی مدارس کا کردار

* دینی مدارس اور ان کے وفاقوں کے منہج کے لحاظ سے دو گروپ سامنے آچکے ہیں، انہیں اب منظم ہوجانا چاہیے۔

- جو گروپ تقسیم ملک سے پہلے کے (دیوبند ماڈل) پر عمل کرنا چاہتے ہیں۔ ہماری رائے میں انہیں اپنی ڈگریاں حکومت سے تسلیم کرانے کا مطالبہ ہی نہیں کرنا چاہیے بلکہ خود اپنی ڈگریاں جاری کرنی چاہئیں اور انہیں ہی اہمیت دینی چاہیے جیسے کہ پرانے مدارس کرتے تھے اور اب بھی کرتے ہیں۔

- وہ گروپ جو دین کے ایسے عالم تیار کرنا چاہتے ہیں جو معاصر دنیاوی علوم سے بھی واقف ہوں، جو جدید مسائل میں امت کی رہنمائی کرسکیں اور معاشرے اور ریاست کے مختلف اداروں میں کام کرسکیں۔ اس گروپ کو مضبوطی اور جرأت سے حکومت سے مطالبہ اور گفت وشنید کرکے اپنی ڈگریاں حکومت سے منظور کرانی چاہئیں۔

* اس گروپ کو لازماً حکومت سے دو مطالبے اور بھی کرنے اور منوانے چاہئیں، ایک یہ کہ حکومت خود اپنے مرکزی تعلیمی دھارے (Mainstream Education) میں دینی تخصص کا انتظام کرے۔ بی ایس، ایم فل اور پی ایچ ڈی میں یہ انتظام موجود ہے (گو بہت زیادہ مؤثر نہیں) اب ثانویہ (عامہ وخاصہ) یعنی میٹرک اور ایف اے کی سطح پر بھی علوم اسلامیہ گروپ وجود میں آنا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ حکومت کو معاصر دنیاوی وتعلیم علوم کو بھی اسلامی بنیادوں پر منظم کرنا چاہیے اور

مغرب پرستی کی روش (خصوصاً انگریزی کے غلبے، غیر ملکی نصابات وامتحانات اور مخلوط تعلیم) سے باز آجانا چاہیے۔

* دینی مدارس اور وفاقوں کے اس دوسرے گروپ کو ابتدائی ومتوسطہ (پرائمری و مڈل) سکول کی تعلیم کا انتظام بھی کرنا چاہیے اور ان کا نصاب اسلامی تقاضوں کے مطابق بنانے کے لیے اس میں اضافے کر لینے چاہئیں۔ میٹرک وایف اے کا اگر حکومت پاکستان علوم اسلامیہ کا گروپ بنادے (لاہور بورڈ اور اوپن یونیورسٹی میں پہلے سے اس کی اجازت ہے) اور بی ایس علوم اسلامیہ کے حکومتی نصاب میں دینی مدارس اپنی مرضی سے اضافے کر کے اسے مزید مؤثر بنا سکتے ہیں۔ اس طرح وہ ایم فل اور پی ایچ ڈی علوم اسلامیہ خود شروع کر کے یا ان کے طلبہ کو اپنے ہاں ہاسٹل میں ٹھہرا کر اور ان پر محنت کر کے مزید مؤثر بنا سکتے ہیں۔

عملی اقدام

دینی مدارس کے جو وفاق عصری ضرورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے دینی تعلیم دینا چاہتے ہیں وہ متحد ہو کر ایک تنظیم بنالیں اور حکومت سے اپنے مطالبے منوانے کے لیے جدوجہد کا آغاز کریں اور دیگر دینی قوتوں کی حمایت حاصل کرنے کی بھی کوشش کریں۔

حکومتی کردار

حکومت پاکستان اگر دینی مدارس کی تعلیم کی اصلاح کے لیے مخلص ہے تو اسے مندرجہ ذیل اقدامات کرنے چاہئیں:

١۔ موجودہ مسلکی دینی مسالک پر مبنی وفاق ختم کر کے نئے غیر مسلکی وفاق میرٹ پر منظور کرنے چاہئیں اور انہیں دوسرے حکومتی سیکنڈری بورڈوں کی طرح سارے مضامین کا امتحان لے کر ڈگری جاری کرنے کا اختیار ہونا چاہیے۔

٢۔ میٹرک وایف اے (ثانویہ عامہ وخاصہ) میں علوم اسلامیہ گروپ تشکیل دینا چاہیے اور اس کا نصاب علماء کی مشاورت سے بنانا چاہیے۔ بی ایس علوم اسلامیہ کے نصاب میں بھی علماء کرام سے مشاورت کر کے اس میں ٹھوس اضافے کرنے چاہئیں۔

٣۔ جدید تعلیم کو اسلام کے مطابق ڈھالنے کے لیے اقدامات کرنے چاہئیں۔

مدیر

سارے دینی مکاتب فکر کے مشترکہ
ایک نئے دینی پلیٹ فارم کی ضرورت
صرف ملی مجلس شرعی ہی اس ضرورت کو پورا کرسکتی ہے

دینی لحاظ سے پاکستانی فرد، معاشرے اور ریاست کی حالت اس وقت دگرگوں ہے۔ اسلام اور مسلم دشمن مغربی قوتوں کے دباؤ کی وجہ سے تربیت صحیح نہ ہونے کی وجہ سے اور دینی سیاسی جماعتوں کے بوجوہ کامیاب نہ ہونے کی وجہ سے پاکستانی حکومتیں آج تک نہ نفاذ شریعت کے لیے سنجیدہ ہوئیں اور نہ انہوں نے ریاستی قوت اسلامی تعلیمات اور اقدار کے فروغ کے لیے استعمال کی۔ دینی اصلاحی جماعتیں، دینی مدارس اور دوسرے دینی ادارے بھی اگرچہ کام کررہے ہیں لیکن زیادہ مؤثر کردار ادا نہیں کرسکے۔ کچھ اس وجہ سے بھی کہ فساد اور بگاڑ کی قوتیں زیادہ منظم، فعال، متحرک اور قوی ہیں اور انہیں مغرب اور پاکستانی اسٹیبلشمنٹ کی کمک حاصل ہے۔

دوسری طرف دینی قوتیں متحد نہیں۔ دینی سیاسی جماعتیں ایک دوسرے کی حریف ہیں۔ مساجد اور مدارس مسلک پر مبنی ہیں۔ فرقہ واریت اور مسلک پرستی کی وجہ سے علماء کرام ایک دوسرے کے حریف ہیں۔ دینی اصلاحی جماعتیں بھی مسلکی بنیاد پر کام کرتی ہیں۔ گویا دینی قوتیں متحد اور ایک پیج پر نہیں بلکہ منتشر اور متفرق ہیں اور ان کا کوئی ایک بڑا مشترکہ پلیٹ فارم ایسا نہیں ہے جس پر دینی مکاتب فکر کی اکثریت متفق ہو۔

اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ حکومت نے مغرب کے دباؤ پر اوقاف ایکٹ مرکز اور صوبوں میں پاس کردیا ہے جس کے ذریعے کسی بھی وقت مدارس و مساجد کو حکومتی کنٹرول میں لایا جاسکتا ہے۔ حکومت نے دینی مدارس کے پرانے وفاقوں کو غیر مؤثر کرنے کے لیے بہت سارے نئے وفاق بنادیے ہیں۔ مغرب کا دباؤ ہے کہ توہین رسالت اور تحفظ ختم نبوت کے قوانین ختم کردیے جائیں اور حکومت اس مطالبے کو رڈ کرنے پر زور دینے والے دینی عناصر کو کچل رہی

ہے۔ یکساں نصاب بنایا جارہا ہے جس میں مغربی تہذیب کے اصول واقدار کو سمویا جارہا ہے۔ حکومت دینی مدارس کو مجبور کررہی ہے کہ وہ میٹرک ایف اے (ثانویہ عامہ وخاصہ) کے امتحان حکومتی بورڈ کے ذریعے دیں اوران کے مضامین پڑھیں اور یکساں نصاب پڑھائیں۔ میڈیا اور مخلوط تعلیم کے ذریعے عریانی اور فحاشی کو فروغ دیا جارہا ہے۔ حکومت نے بی اے اورایم اے کے امتحانات کا نظام ختم کردیا ہے اورایسوسی ایٹ ڈگری اور بی ایس کا نظام نافذ کردیا ہے اوران کے پرائیویٹ امتحان پر پابندی لگادی ہے گویا دینی مدارس کی ڈگریاں جو تھوڑی بہت حکومتی منظوری رکھتی تھیں، ان کا نظام بھی ختم کردیا گیا ہے۔

ان حالات میں ضرورت اس بات کی ہے کہ دینی قوتوں کا ایک مشترکہ بڑا پلیٹ فارم ہو تا کہ اس فساد اور بگاڑ کے سامنے باند باندھا جاسکے۔ اس مشترکہ پلیٹ فارم/ جماعت/تحریک کے عملی قیام کے لیے ہماری تجاویز درج ذیل ہیں:

۱۔ ضروری ہے کہ مجوزہ پلیٹ فارم کسی ایک دینی مکتب فکر یا دینی سیاسی جماعت کی طرف سے قائم نہ کیا جائے بلکہ اس میں سارے دینی مکاتب فکر شامل ہوں کیونکہ اگر کسی ایک مسلک کی علمبردار جماعت نے اس طرح کا پلیٹ فارم قائم کیا تو دوسری جماعتیں اس میں شامل نہ ہوں گی۔ اوراگر دینی قوتیں متحد نہ ہوں تو ظاہر ہے کوئی بڑی تحریک نہ تو چلائی جاسکتی ہے اور نہ اسے کامیاب بنایا جاسکتا ہے۔

۲۔ اس تحریک کی قیادت ایسی ہونی چاہیے جو ہمارے ملک کے سواد اعظم کے لیے قابل قبول ہو۔ اگرچہ آج تک پاکستان میں مسالک کی بنیاد پر مردم شماری نہیں ہوئی اس لیے حتمی طور پر یہ کہنا مشکل ہے کہ کس مسلک کے متبعین کی تعداد کتنی ہے، تاہم ایک اندازہ یہ ہے کہ پاکستان کی ستر اسّی فیصد آبادی احناف (حنفی بریلوی اور حنفی دیوبندیوں) پر مشتمل ہے لہٰذا ہماری تجویز یہ ہے کہ مجوزہ تحریک کے صدر اور جنرل سیکرٹری احناف میں سے ہوں۔

۳۔ مجوزہ تحریک کا لائحہ عمل دو سطحوں پر مشتمل ہونا چاہیے۔ ایک ہنگامی مسائل سے نمٹنا جیسے آج کل اوقاف قوانین کا مسئلہ ہے۔ اس کے لیے تیز رفتار اقدامات اور تحریک چلانے کی

ضرورت پڑسکتی ہے۔

دوسرے: مستقل نوعیت کی نظریاتی جدوجہد کے لیے لائحہ عمل وضع کر کے اس پر عمل کرنا جیسے انسدادسود، جدید تعلیم کو غیر اسلامی ہونے سے بچانا، عوام وخواص کے لیے دعوت واصلاح، اخلاقی تربیت، خطبات جمعہ میں ہم آہنگی، مساجد کو مرکز بنا کر خدمت خلق کے اقدامات کرنا جیسے غریبوں کی مدد، فراہمیٔ عدل وانصاف کے لیے مصالحتی کمیٹی کا قیام، بلاسود تجارت کو فروغ دینا وغیرہ۔

۴۔ کوشش کی جائے کہ اس طرح کی تحریک میں ہر مکتب فکر کی نمایاں شخصیات شامل ہوں اور ہر مسلک کے ذیلی گروہوں/ جماعتوں/ اداروں میں سے زیادہ سے زیادہ جماعتیں اس تحریک میں شامل ہوں تاکہ یہ ساری دینی قوتوں کا نمائندہ پلیٹ فارم بن سکے اور عوام وخواص کو متحرک کر کے اپنے ساتھ ملا سکے۔

۵۔ ملی مجلس شرعی کا ممکنہ کردار: ملی مجلس شرعی سارے دینی مکاتب فکر کی ایک علمی وفکری مجلس ہے جو پچھلے چودہ سال سے کامیابی سے کام کر رہی ہے۔ مذکورہ بالا حالات کے پیش نظر مجلس نے اپنے دائرہ کار کو بڑھانے کا فیصلہ کیا ہے تاکہ مذکورہ بالا خلاء کو پر کیا جاسکے اور معاشرے میں بڑھتے ہوئے غیر اسلامی افکار ورجحانات کو روکنے کے لیے سارے مکاتب فکر کا ایک مشترکہ پلیٹ فارم وجود میں آسکے۔ دین کا درد رکھنے والے اصحاب دانش، علماء کرام اور دینی عناصر کا فرض ہے کہ وہ ملی مجلس شرعی کو سارے دینی مکاتب فکر کا ایک بڑا اور مؤثر پلیٹ فارم بنانے میں اپنا کردار ادا کریں۔

تعلیم و تربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

بیانیے کی قوت اور اس کا فروغ و نفاذ

سماجی اور سیاسی زندگی میں بیانیے کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ اگر آپ لوگوں کو اپنے پیچھے لگانا چاہتے ہیں تو آپ کو اپنا بیانیہ دینا پڑے گا۔ آپ کا بیانیہ جن جن کو پسند آئے گا وہ اس بیانیے کی وجہ سے آپ کی قیادت اور سیادت کو تسلیم کریں گے اور آپ کی پیروی پر تیار ہوں گے۔ اب آپ کا بیانیہ کیسا ہو کہ لوگوں کو پسند آئے یا ان کے لیے پسندیدہ بنایا جا سکے۔ بیانیے کے اس پہلو کا تعلق لوگوں کے مفاد، ان کے ایمان و یقین اور ان کے فہم و ادراک سے ہے۔ جو بیانیہ لوگوں کے مفاد کے کسی پہلو سے بھی ان سے متعلق نہ ہو وہ ان کے قلب و ذہن میں جگہ نہیں پا سکے گا، اور جو بیانیہ کسی سطح پر لوگوں کے مفاد میں بھی ہو اور پھر ان کے ایمان و یقین کے اطمینان کا باعث بھی ہو تو وہ بیانیہ یقیناً لوگوں کے قلب و ذہن میں جگہ پالے گا۔ اس کے ساتھ یہ بہت ضروری ہے کہ بیانیہ جو آپ پیش کر رہے ہیں وہ لوگوں کی سمجھ بھی آئے، ان کے مفاد میں بھی ہو اور پھر ان کے ایمان و یقین کو بھی اپیل کرے تو وہ بیانیہ زود یا بدیر لوگوں کو متحرک کرے گا اور نتیجتاً بیانیہ پیش کرنے والے گروہ کی قیادت اور سیادت قبول کرے گا نیز جمہوری ماحول میسر آنے کی صورت میں اپنا تائیدی ہاتھ اس گروہ کے ہاتھ میں دے دے گا جس نے وہ بیانیہ پیش کیا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ کسی معاشرے میں برسرکار ایک دینی سیاسی گروہ کیا بیانیہ دے اور کس قسم کا عمل اختیار کرے کہ اس کا بیانیہ عامۃ الناس کا بیانیہ بن جائے اور اس طرح جو اجتماعیت حاصل ہو وہ معاشرے میں فیصلہ سازی کا اختیار حاصل کر کے اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی حاکمیت قائم کر دے۔

مسلمانوں کو اقامت دین کا فریضہ سونپا گیا ہے لیکن عموماً عامۃ الناس اپنے اس فریضے کو پورا کرنے کی طرف توجہ نہیں دیتے۔ جب ہم فریضہ اقامت دین کی بات کرتے ہیں تو یہ بات عام لوگوں کے سر کے اوپر سے گزر جاتی ہے حتیٰ کہ وہ مسلمان بھی جو نماز روزہ کے پابند ہوتے ہیں، حج

عمرہ بھی کرتے ہیں اور صدقات وخیرات دینے کے لیے ہاتھ کھلا رکھتے ہیں، وہ بھی سمجھتے ہیں کہ ہم نیکی کے کاموں میں حصہ لے تو رہے ہیں تو بس ہم اقامت دین کا فرض ادا کر رہے ہیں۔ وہ اسلام کو انفرادی سطح پر لے رہے ہوتے ہیں اور وہ بھی نماز روزے کی حد تک، اسلام کو اجتماعی زندگی میں روبہ عمل لانے کا ان کا فہم ناقص ہوتا ہے نیز انفرادی زندگی میں جامعیت کے ساتھ اسلام پر عمل پیرا ہونے کا ان کا تصور بھی جزوی ہوتا ہے۔ اگر ہم فریضہ اقامت دین کو آسان لفظوں میں بیان کریں یعنی ہم کہیں کہ ہمارا مقصد اللہ تعالیٰ کی حاکمیت، اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی حاکمیت یا بالفظ دیگر قرآن وسنت کی حاکمیت قائم کرنا ہے تو قرآن وسنت کی یہ حاکمیت ہماری انفرادی زندگی پر بھی ہوگی ہماری اجتماعی زندگی پر بھی ہوگی، ہماری حکومت، ہماری عدالت، ہماری تجارت، ہماری تعلیم اور ہمارے باہمی تعلقات پر بھی ہوگی تو لوگوں کو فریضہ اقامت دین کا بہتر فہم حاصل ہوگا۔

قرآن وسنت پر لوگوں کا ایمان اور یقین ہے۔ لوگوں کو جب باور کرایا جائے گا کہ قرآن وسنت کی حاکمیت سے ہی برائیاں ختم ہوں گی، اچھائیوں کو فروغ ملے گا، انصاف اور عدل کا بول بالا ہوگا۔ حقدار کو حق ملے گا، کرپشن کے راستے بند ہوں گے، اللہ نے انسانوں کو جو بنیادی حقوق عطا کیے ہیں ان کی پاسداری ہوگی تو لوگ محسوس کریں گے کہ ان کا دنیاوی مفاد قرآن وسنت کی حکمرانی میں ہے اور آخرت کا مفاد تو بہر حال قرآن وسنت کی حکمرانی میں ہی ہے کہ جب قرآن وسنت کی حکمرانی فرد پر بھی ہوگی، معاشرے پر بھی ہوگی اور حکومت کے ایوانوں میں بھی ہوگی تو آخرت کا مفاد بھی حاصل ہوگا اور اس دنیا کا مفاد بھی حاصل ہوگا۔ انسانوں کی حکمرانی، کسی گروہ کی حکمرانی یا بڑھ کر کسی سیاسی پارٹی کی حکمرانی کی نفی کر کے جب اللہ کی حکمرانی، اللہ کے رسول کی حکمرانی، قرآن وسنت کی حکمرانی کی بات کی جائے گی تو معاشرے میں پارٹی بازی کا شر، کسی کی ذاتی چودھراہٹ کا شر اور گروہی کھینچا تانی کا خاتمہ ہوگا۔ معاشرتی استحکام حاصل ہوگا اور لوگوں کی زندگیاں خوشحال ہو جائیں گی۔

قرآن وسنت کی حکمرانی کا بیانیہ ایک ایسا بیانیہ ہے کہ اس پر قومی اتفاق رائے حاصل کرنا نسبتاً آسان ہے۔ جو گروہ اس بیانیے کو لے کر اٹھے وہ کسی کی مخالفت پر آمادہ نہ ہو۔ اس کی دعوت کا

نقطہ عروج یہی بیانیہ ہو کہ ہم قرآن وسنت کی حکمرانی چاہتے ہیں۔ اگر کوئی فرد اس بیانیے پر ہمارے ساتھ تعاون کرتا ہے تو ہم خوش آمدید کہیں گے، اگر کوئی گروہ یا پارٹی ہمارے اس بیانیے کو لے کر چلتی ہے تو ہم اس کے پابہ رکاب ہوں گے۔ اس بیانیے پر جو بھی عمل درآمد کے لیے تیار ہے ہم اس کے ساتھی ہیں اور اس بیانیے کے حوالے سے جو بھی ہمارا ہاتھ بٹاتا ہے ہم اس کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ ضروری نہیں کہ اس بیانیے پر عمل ہمارے ہی ہاتھوں سے ہو۔ یہ اللہ اور اللہ کے رسول (ﷺ) کا کام ہے جو بھی اس کام کو کرے گا ہم تعاون کریں گے۔ ہمارا نعرہ ہے ﴿وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۠ وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۠﴾

قرآن وسنت کی حکمرانی کا بیانیہ ایسا ہے کہ کوئی بھی اس سے روگردانی نہیں کرسکتا۔ فرقہ وارانہ اور مسلکی اختلاف پیچھے رہ جائے گا کیونکہ کوئی فرقہ اور کسی مسلک کے لوگ قرآن وسنت کی حکمرانی کا انکار نہیں کرسکتا۔ لبرلز اور سیکولرز کی ایک چھوٹی سی اقلیت چھٹ کر علیحدہ کھڑی ہوگی جن کی کوئی حیثیت ہوگی نہ طاقت۔ مقتدر قوتیں ہوں یا عوامی قوتیں سب قرآن وسنت کی حکمرانی کے بیانیے کے سامنے سرنگوں ہوں گی۔ بس اتنی سی بات ہے کہ جو گروہ قرآن وسنت کی حکمرانی کا بیانیہ آغاز میں پیش کرے وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار کی طرح اس پر جم کر کھڑا رہے۔ اِدھر اُدھر کی نعرہ بازی سے اجتناب کرے۔ کوئی کرپشن کی بات کرے، مہنگائی کی بات کرے، امن وامان کی بات کرے تو جواب یہ ہو کہ یہ تو علامتیں ہیں اس مرض کی جو ہماری قوم کو لاحق ہے اور وہ مرض ہے قرآن وسنت کی حکمرانی سے روگردانی۔ جب قرآن وسنت کی حکمرانی قائم ہوگی اور یہ حکمرانی فرد کی زندگی پر بھی قائم ہوتی ہے۔ تھانے، کچہری پر بھی قائم ہوتی ہے، عدالت اور سیاسی قیادت پر بھی قائم ہوتی ہے۔ پارلیمنٹ اور سیکرٹریٹ پر بھی قائم ہوتی ہے۔ فوج اور خارجہ تعلقات پر بھی قائم ہوتی ہے۔ اور جب یہ حکمرانی قائم ہوگی تو مرض کے دور ہونے سے اس کی علامتیں بھی ختم ہوجائیں گی۔ خیر پر قائم اس گروہ کا قرآن وسنت کی حکمرانی کے بیانیے پر مضبوطی کے ساتھ قیام ہو۔ ہر بیان، ہر سرگرمی، ہر تعلق اور تعلیم وتربیت کا ہر عمل اس بیانیے کو سربلند کرنے کا عمل ہو، کچھ وقت لگے گا لیکن آخرکار یہ بیانیہ لوگوں کے دل ودماغ میں جگہ پالے گا۔

اس بیانیے کے فروغ کے لیے علماء کرام کا تعاون ضروری ہے۔ تعلیمی اداروں کے اساتذہ کا تعاون ضروری ہے اور خطبہ ہائے جمعہ کی طاقت کا استعمال ضروری ہے۔ اللہ اور اللہ کے رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) کی حکمرانی، قرآن وسنت کی حکمرانی کے لیے اللہ کے گھر کو مرکز بنانا ہوگا اور سب سے اہم بات یہ کہ جو گروہ اس بیانیے کو لے کر اٹھے وہ ان کے دل میں سب کے لیے محبت، ہمدردی اور احترام کا جذبہ ہو۔ کسی شخص یا گروہ پر ان کی طرف سے تنقید یا تنقیدوں کا شائبہ تک نہ ہو۔ ایسی کیفیت پیدا ہو کہ وہ گروہِ خیر اندیشاں سب کی محبت کا نہیں تو کم از کم کسی کی نفرت کا ہدف تو نہ ہو کیونکہ گروہ کے خلاف نفرت آخر کار اس کے بیانیے کے خلاف نفرت میں ڈھل جاتی ہے اور یہ عمل خیر کے فروغ کے لیے زہر قاتل ہے۔

بیانیے کے نفاذ کی حکمت عملی

مسلمانوں کی بنیادی ذمہ داری فریضہ اقامت دین یعنی قرآن وسنت کی حکمرانی قائم کرنا ہے۔ قرآن وسنت کی یہ مطلوبہ حکمرانی سب سے پہلے فرد پر قائم ہوگی پھر ایسے افراد کے معاشرہ پر جو اپنے اوپر قرآن وسنت کی مکمل حکمرانی قبول کر چکے ہوں گے۔ معاشرے پر قرآن وسنت کی حکمرانی کا نقطہ عروج ریاست کے تمام اداروں پر قرآن وسنت کی حکمرانی ہوگا۔ پارلیمنٹ سے لے کر ولیج کونسل اور محلہ کی کونسل تک، سپریم کورٹ سے لے کر گاؤں کے پنچائتی نظام اور مصالحتی کونسلوں تک، سنٹرل سیکرٹریٹ سے لے کر تھانے اور پٹوار کے دفاتر تک، پولیس سے لے کر فوجی اداروں تک، یونیورسٹی سے لے کر پرائمری سکول تک اور خانقاہ سے لے کر مسجد تک، سب جگہوں، سب اداروں پر قرآن وسنت کی حکمرانی ہوگی۔ حکمرانوں کا انتخاب، ان کا نصب وعزل قرآن وسنت کے تقاضوں اور خلفائے راشدین کی روایت کے مطابق ہوگا۔ قرآن وسنت کی حکمرانی کی یہ ہمہ گیریت تقاضا کرتی ہے کہ ایک جماعت ہو جو ﴿كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ﴾ کے قرآنی حکم کے مطابق اس کے لیے سوچے، منصوبہ بندی کرے، لوگوں کو تیار کرے اور مسلسل جدوجہد کے ذریعے قرآن وسنت کی حکمرانی قائم کرنے کا فریضہ سرانجام دے۔ خیر کے اس گروہ کا مقصد اپنی حکمرانی کی راہ

ہموار کرنا نہ ہو بلکہ صرف اور صرف قرآن وسنت کی حکمرانی اس کا بنیادی اور آخری مقصد ہو۔

قرآن وسنت کی حکمرانی ایک ہمہ گیر اتفاق رائے کا تقاضا کرتا ہے۔ عام جمہوری اصولوں کے مطابق محض اکثریت اس عظیم مقصد کو حاصل کرنے کے لیے شاید کافی نہ ہو۔ دوسری طرف ہمارے معاشرے کی موجودہ ساخت، سیاسی پارٹی بازی، مذہبی فرقہ بندی، علاقائی اور گروہی مفادات یہ پتہ دیتے ہیں کہ قرآن وسنت کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے اگر کوئی گروہ یا پارٹی کام کر رہی ہے تو اُسے ہر قسم کی کشمکش سے اجتناب کرنا ہوگا۔ قرآن وسنت کی حکمرانی کی خواہش کے ساتھ اُسے محبت، تعاون، ہمدردی اور احترام کا رویہ اپنانا ہوگا، ان کے لیے بھی جو اس کی کھلی مخالفت پر کمر بستہ ہوں اور ان کے لیے بھی جو اس کے ساتھ تعاون پر آمادہ ہوں۔ قرآن وسنت کی حکمرانی کے لیے کام کرنے والے اس گروہِ خیر کے کسی اقدام سے ذاتی غرض، اپنا اقتدار اور گروہی مفاد کا حصول ظاہر نہ ہو۔ اس کا بیانیہ ہو کہ لوگ اگر سمجھتے ہیں کہ قرآن وسنت کی حکمرانی ہمارے ہاتھوں سے قائم ہوسکتی ہے تو ہمارا ساتھ دیں۔ اگر کوئی دوسرا گروہ آگے بڑھ کر اس کارِ خیر کو اپنے ہاتھ میں لیتا ہے تو ہمارا غیر مشروط تعاون اس گروہ کو حاصل ہوگا۔ قرآن وسنت کی حکمرانی سے مراد تو اللہ کی حکمرانی، اللہ کے رسول ﷺ کی حکمرانی ہے کسی فرد، گروہ یا پارٹی کی حکمرانی نہیں ہے۔ اس کے لیے بلاتمیز رنگ ونسل، بلاتمیز مسلک وفرقہ اور بلاتمیز علاقہ یا صوبہ اتفاقِ رائے حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ قرآن وسنت کی حکمرانی کا مقصد ایسا مقصد ہے کہ کوئی مسلمان کھلے طور پر اس سے اختلاف نہیں کرسکتا۔ اسی نکتے کو استعمال کرتے ہوئے قرآن وسنت کی حکمرانی قومی ایجنڈا بنادیا جائے۔ اس عظیم مقصد کی طرف دعوت دینے والی پارٹی جب مکمل بے غرضی کے ساتھ کام کرے گی، سب کو ان کی کمزوریوں، خامیوں اور خوبیوں کے ساتھ محبت ہمدردی اور احترام کے جذبے کے ساتھ قبول کرے گی۔ طعن وتشنیع، مخالفت اور الزام بازی، بہتان بازی سے اجتناب کرے گی تو امکان یہ ہے کہ ایسی پارٹی، ایسے گروہ کی مخالفت کسی کے لیے بھی مشکل ہوگی۔ یہ گروہ یا پارٹی جب کبھی انتخابی معرکے میں شامل ہوگی تو کسی بھی پارٹی سے کھڑے ہونے والے کسی عالم

دین کے مقابلے میں اپنا امیدوار کھڑا نہیں کرے گی نیز دیگر پارٹیوں سے جو امیدوار بھی قرآن وسنت کی حکمرانی قائم کرنے کے لیے کھلے عام وعدہ کرے گا اس کی مخالفت بھی نہیں کرے گی نیز مسجد کو مرکز بناتے ہوئے آئمہ مساجد اور خطیبان کرام کو بھی اس مہم میں شامل کرے گی تو امکان یہ ہے کہ قرآن وسنت کی حکمرانی کا مطالبہ عوامی مطالبہ بن جائے گا۔ یہ حکمت عملی اس لیے تجویز کی جا رہی ہے کہ قرآن وسنت کی حکمرانی کا منشور لے کر اٹھنے والی کوئی بھی پارٹی تنِ تنہا اپنے طور پر کبھی بھی اتنی عوامی قوت اور انتخابی اکثریت حاصل نہیں کر پائے گی کہ وہ محض اپنے بل بوتے پر قرآن وسنت کی مکمل حکمرانی کا خواب پورا کر سکے۔ اس کے لیے وسیع سطح پر قومی اتفاق رائے کی ضرورت ہے۔ اس کے بغیر قانون بن بھی جائے تو نفاذ ممکن نہیں ہوگا۔ اس سارے کام کی پشت پر ٹھوس تربیتی نظام، وسیع البنیاد لٹریچر، ابلاغ عامہ کا ہمہ گیر استعمال اور رجالِ کار تیار کرنے کے کچھ تعلیمی اداروں کی ضرورت ہوگی۔ ان سب امور کا اہتمام وہ گروہِ خیر اور وہ پارٹی کرے گی جو ابتداً قرآن وسنت کی حکمرانی کی دعوت لے کر اٹھی ہے۔ اس وقت صورتِ حال یہ ہے کہ وہ لوگ جنہوں نے موجودہ قانون کی حکمرانی قائم کرنا ہے وہ اخلاقی، تعلیمی اور رجحان طبع کی سطح پر اس حکمرانی کو عدل وانصاف اور غیر جانبداری کے ساتھ مؤثر طریقے سے نافذ کرنے کے اہل نہیں ہیں۔ یہ جو ہم قرآن وسنت کی حکمرانی کی بات کر رہے ہیں تو اس کے لیے تو یہ دفتری اہل کار، یہ عدالتی ذمہ دار اور معیشت وترقی کے معاملات کو لے کر چلنے والے ماہرین قرآن وسنت کے تقاضوں کو جانتے ہی نہیں ہیں تو ان تقاضوں سے عہدہ برآ کیسے ہوں گے؟ لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ قرآن وسنت کی حکمرانی کے عظیم کام کی طرف بلانے والا گروہ یا پارٹی ساتھ ہی ساتھ یہ ذمہ داری بھی سنبھالے کہ سہانے مستقبل کے خواب کو حقیقت بنانے کے لیے رجالِ کار کی تیاری بھی کرے تا کہ مقصد کے حصول کے بعد اُسے پائیداری عطا کرنے میں مشکل پیش نہ آئے۔

دینی جماعتوں کا بیانیہ کیا ہونا چاہیے؟

دینی جماعتوں کا بیانیہ کرپشن، مہنگائی، امن وامان، جمہوریت اور سول سپرمیسی نہیں ہونا

چاہیے بلکہ ان کا بیانیہ اقامت دین ہونا چاہیے یعنی اللہ اور اس کے رسول یعنی قرآن وسنت کی حکمرانی۔ کرپشن، مہنگائی، امن امان کی خرابی، جمہوری قدروں کا فقدان اور سویلین بالادستی کا فقدان بنیادی امراض نہیں ہیں بلکہ علامات ہیں مرض کی جو قرآن وسنت کی حکمرانی نہ ہونے کی وجہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ معاشرے میں اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی حکمرانی یعنی قرآن وسنت کی حکمرانی قائم ہو جائے تو کرپشن کرنا ممکن نہیں ہوگا، مہنگائی کا قلع قمع ہوگا، عدل وانصاف قائم ہونے کی وجہ سے امن وامان کا مسئلہ حل ہو جائے گا، نیز جب حکمرانی اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) کی ہوگی تو سپرمیسی یعنی بالادستی بھی اللہ اور اس کے رسول (ﷺ) یعنی قرآن وسنت کی ہوگی۔ مقتدر قوتوں، دفاعی اداروں، سویلین کی بالادستی کا تو سوال ہی ختم ہو جائے گا۔ پس ضرورت اس امر کی ہے کہ لوگوں کو اللہ اور اس کے رسول کی حکمرانی یعنی قرآن وسنت کی حکمرانی کی طرف بلایا جائے۔ انہیں ان کے فوائد سے آگاہ کیا جائے اور انہیں ذہناً اور عملاً اس عظیم کام پر عمل پیرا ہو جانے کے لیے تیار کیا جائے۔ اس نقطۂ نگاہ سے ہمیں کسی کو چور، ڈاکو، ڈکٹیٹر اور ظالم کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ جب ہم کسی کو چور ڈاکو، لٹیرا ظالم کہتے ہیں تو ضد پیدا ہوتی ہے اور جن کو ہم راہِ راست پر لا کر قرآن وسنت کی حکمرانی قائم کرنا چاہتے ہیں وہ تعصب، ہٹ دھرمی، اور طعن وتشنیع کی وجہ سے ہماری بات ہی نہیں سنیں گے لیکن اگر ہم ان کی دنیا وآخرت کی کامیابی ہمدردانہ رویے اور عزت واحترام کے ساتھ قرآن وسنت کی دعوت دیں گے تو امکان ہے کہ اللہ ان کے دل ودماغ کو کھول دے اور وہ ہمارے بیانیے کے پشتیبان بن جائیں۔ قرآن وسنت کی حکمرانی کا بیانیہ ایک طرف غیر متنازع ہے اور دوسری طرف جب تک اس بیانیے کی پشت پر وسیع قبولیت اور نفاذی طاقت نہ ہو تو بیانیے کو کامیابی سے ہم کنار نہیں کرایا جا سکتا۔

تزکیۂ نفس امام ابن قیم الجوزیہ

کیا آپ کا قلب بیمار ہے؟

بیمار قلب کی کچھ علامات ہیں:

پہلی علامت: جب انسان فانی چیزوں کو باقی چیزوں پر ترجیح دینے لگے تو وہ سمجھ لے کہ اس کا قلب بیمار ہے۔ مثلاً دنیا کا گھر اچھا لگتا ہے مگر آخرت کا گھر بنانے کی فکر نہیں ہے۔ دنیا میں عزت مل جائے مگر آخرت کی عزت یا ذلت کی سوچ دل میں نہیں۔ دنیا میں آسانیاں ملیں مگر آخرت کے عذاب سے بچنے کی پرواہ نہیں۔

دوسری علامت: جب انسان رونا بند کر دے تو وہ سمجھ لے کہ اس کا دل سخت ہو چکا ہے۔ یاد رہے کہ کبھی انسان کی آنکھیں روتی ہیں اور کبھی انسان کا دل روتا ہے۔ بہر حال رونے سے توبہ کے لیے قبولیت کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور جسے رونا نہ آئے وہ سمجھ لے کہ اس کا قلب بیمار ہے۔

تیسری علامت: مخلوق سے ملنے کی تو تمنا ہو لیکن اسے اللہ رب العزت سے ملنا یاد ہی نہ ہو.... تو سمجھ لے کہ یہ میرے دل کی موت ہے۔ لوگوں کے ایک دوسرے کے ساتھ ایسے تعلقات ہوتے ہیں کہ ان کے دل میں ایک دوسرے سے ملنے کی تمنا ہوتی ہے، وہ اداس ہوتے ہیں اور انہیں انتظار ہوتا ہے، مگر اسے اللہ رب العزت کی ملاقات یاد ہی نہیں ہوتی۔

چوتھی علامت: جب انسان کا نفس اللہ رب العزت کی یاد سے گھبرائے اور مخلوق کے ساتھ بیٹھنے سے خوش ہو تو یہ بھی قلب کی موت کی پہچان ہے۔ اللہ کی یاد سے گھبرانے کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان کا دل تسبیح پڑھنے، ذکر اذکار کرنے اور مراقبہ کرنے سے گھبرائے۔ اسے مصلے پر بیٹھنا بوجھ محسوس ہوتا ہو۔ ذاکر انسان مصلے پر اسی سکون کے ساتھ بیٹھتا ہے جس طرح بچہ ماں کی گود میں سکون کے ساتھ بیٹھتا ہے۔ اور جس کے قلب میں کجی ہوتی ہے اس کے لیے مصلے پر بیٹھنا مشکل ہوتا ہے۔ وہ سلام پھیر کر مسجد سے بھاگتا ہے۔

تزکیۂ نفس

ادارہ

ایک تھا لوہار

عبداللہ طاہر جب خراسان کے گورنر تھے اور نیشاپور اس کا دارالحکومت تھا تو ایک لوہار شہر ہرات سے نیشاپور گیا اور چند دنوں تک وہاں کاروبار کیا۔ پھر اپنے اہل وعیال سے ملاقات کے لیے وطن لوٹنے کا ارادہ کیا اور رات کے پچھلے پہر سفر کرنا شروع کر دیا۔ ان ہی دنوں عبداللہ طاہر نے سپاہیوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ شہر کے راستوں کو محفوظ بنائیں تا کہ کسی مسافر کو کوئی خطرہ لاحق نہ ہو۔

اتفاق ایسا ہوا کہ سپاہیوں نے اسی رات چند چوروں کو گرفتار کیا اور امیر خراسان (عبداللہ طاہر) کو اس کی خبر بھی پہنچا دی لیکن اچانک ان میں سے ایک چور بھاگ گیا۔ اب یہ گھبرائے اگر امیر کو معلوم ہو گیا کہ ایک چور بھاگ گیا ہے تو وہ ہمیں سزا دے گا۔ اتنے میں انہیں سفر کرتا ہوا یہ مسافر (لوہار) نظر آیا۔ انھوں نے اپنی جان بچانے کی خاطر اس بے گناہ شخص کو فوراً گرفتار کر لیا اور باقی چوروں کے ساتھ اسے بھی امیر کے سامنے پیش کر دیا۔ امیر خراسان نے سمجھا کہ یہ سب چوری کرتے ہوئے پکڑے گئے ہیں اس لیے مزید کسی تفتیش وتحقیق کے بغیر سب کو قید کرنے کا حکم دے دیا۔

نیک سیرت لوہار سمجھ گیا کہ اب میرا معاملہ صرف اللہ جل شانہ کی بارگاہ سے ہی حل ہوسکتا ہے اور میرا مقصد اسی کے کرم سے حاصل ہوسکتا ہے لہٰذا اس نے وضو کیا اور قید خانہ کے ایک گوشہ میں نماز پڑھنا شروع کر دی۔ ہر دو رکعت کے بعد سر سجدہ میں رکھ کر اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رقت انگیز دعائیں اور دل سوز مناجات شروع کر دیتا اور کہتا۔ ''اے میرے مالک! تو اچھی طرح جانتا ہے میں بے قصور ہوں''۔ جب رات ہوئی تو عبداللہ طاہر نے خواب دیکھا کہ چار بہادر اور طاقتور لوگ آئے اور سختی سے اس کے تخت کے چاروں پایوں کو پکڑ کر اٹھایا اور الٹنے لگے۔ اتنے میں اس کی نیند ٹوٹ گئی۔ اس نے فوراً لَا حَوْلَ وَلَا قُوَّةَ اِلَّا بِاللّٰهِ پڑھا۔ پھر وضو کیا اور اس احکم الحاکمین کی بارگاہ میں دو رکعت نماز ادا کی جس کی طرف ہر شاہ وگدا اپنی اپنی پریشانیوں کے وقت رجوع کرتے ہیں۔ اس کے بعد دوبارہ سویا تو پھر وہی خواب دیکھا۔ اس طرح چار مرتبہ ہوا۔ ہر بار وہ یہی دیکھتا تھا کہ چاروں نوجوان اس کے تخت کے پایوں کو پکڑ کر اٹھاتے ہیں اور الٹنا چاہتے

ہیں۔امیر خراسان عبداللہ طاہر اس واقعہ سے گھبرا گئے اور انہیں یقین ہوگیا کہ ضرور اس میں کسی مظلوم کی آہ کا اثر ہے۔

امیر خراسان نے رات ہی میں جیلر کو بلوایا اور اس سے پوچھا کہ بتاؤ! تمہارے علم میں کوئی مظلوم شخص جیل میں بند تو نہیں کر دیا گیا ہے؟ جیلر نے عرض کیا۔عالیجاہ! میں یہ تو نہیں جانتا کہ مظلوم کون ہے لیکن اتنی بات ضرور ہے کہ میں ایک شخص کو دیکھ رہا ہوں جو جیل میں نماز پڑھتا ہے اور رقت انگیز و دل سوز دعائیں کرتا ہے۔

امیر نے حکم دیا: اسے فوراً حاضر کیا جائے۔جب وہ شخص امیر کے سامنے حاضر ہوا تو امیر نے اس کے معاملہ کی تحقیق کی۔معلوم ہوا کہ وہ بے قصور ہے۔امیر نے اس شخص سے معذرت کی اور کہا: آپ میرے ساتھ تین کام کیجئے۔

۱۔آپ مجھے معاف کر دیں

۲۔میری طرف سے ایک ہزار درہم قبول فرمائیں

۳۔جب بھی آپ کو کسی قسم کی پریشانی درپیش ہو تو میرے پاس تشریف لائیں تاکہ میں آپ کی مدد کر سکوں۔

نیک سیرت لوہار نے کہا: آپ نے جو یہ فرمایا ہے کہ میں آپ کو معاف کر دوں تو میں نے آپ کو معاف کر دیا۔اور آپ نے جو یہ فرمایا کہ ایک ہزار درہم قبول کرلوں تو وہ بھی میں نے قبول کیے لیکن آپ نے جو یہ کہا ہے کہ جب مجھے کوئی مشکل درپیش ہو تو میں آپ کے پاس آؤں، یہ مجھ سے نہیں ہوسکتا۔

امیر نے پوچھا: یہ کیوں نہیں ہوسکتا؟ تو اس شخص نے جواب دیا کہ وہ خالق و مالک جل جلالہ جو مجھ جیسے فقیر کے لیے آپ جیسے بادشاہ کا تخت ایک رات میں چار مرتبہ اوندھا کرسکتا ہے تو اس کو چھوڑ دینا اور اپنی ضرورت کسی دوسرے کے پاس لے جانا اصولِ بندگی کے خلاف ہے۔میرا وہ کون سا کام ہے جو اس سے مانگنے سے پورا نہیں ہوجاتا کہ میں اسے غیر کے پاس لے جاؤں؟ (ریاض الناصحین،ص:۱۰۴)

اسلام اور مغرب

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری

مغربی مفکرین اور فلاسفہ کے افکار و آراء (۲)
ایک مختصر مگر جامع تجزیہ

مغرب میں ''خیر'' نہیں ''ارادہ'' غالب ہے

سطور بالا میں ہم نے کانٹ اور ہیگل کا جو تصور پیش کیا وہ یہ تھا کہ مغربی تہذیب اور اقدار کا غلبہ انسانیت کی فلاح اور خیر کی چیز ہے۔ لیکن تحریک رومانویت سے ایک دوسرا دھارا بھی نکلتا ہے جو مغربی تہذیب کو فلاح و خیر وغیرہ نہیں گردانتا مثلاً شوپنہار کے ہاں تو بالخصوص یہ بنیاد موجود ہے کہ وہ مغربی تہذیب کے غلبہ کو واقعتاً خیر تصور نہیں کرتا بلکہ کہتا ہے کہ جو چیز غالب (Dominant) ہوئی ہے وہ ارادہ (Will) ہے۔ جس چیز نے مغرب کے ذریعہ غلبہ حاصل کیا ہے وہ عقل نہیں ہے اور Will ایک اندھی قوت (Blind Force) کا نام ہے۔ اس اندھی قوت نے دنیا کو غم اور دُکھ سے بھر دیا ہے۔ اس قوت اور اس کے غلبہ کو کسی صورت روکا نہیں جا سکتا۔ قنوطیت کا یہ غلبہ مغربی فلسفیوں میں شروع سے چلا آرہا ہے حتیٰ کہ فوکالٹ (Foucault) میں بھی، جو بیسویں صدی کا مفکر ہے اور ۱۹۸۴ء تک زندہ رہا۔ اس کے افکار پر بھی یاسیت وقنوطیت شدت کے ساتھ غالب ہے۔

مغربی تہذیب میں یہ دونوں دھارے موجود ہیں۔ ایک طرف تو پراُمید (Optimistic) تصور کہ مغربی تہذیب کا غلبہ خیر وفلاح ہے، دوسری طرف قنوطی تصور ہے جو اس کو خیر وفلاں نہیں سمجھتا لیکن مغربی غلبہ کی ناگزیریت پر دونوں یک زبان ہیں۔

اس دوسرے دھارے کا اظہار ایک اور فلسفی کرتا ہے جس کا نام کرکیگارڈ (Kierkegaard) ہے۔ اس کے ہاں یہ خیال موجود ہے کہ انسان جو کچھ پسند کرتا ہے اس کو ہم عقلی بنیادوں پر جواز فراہم نہیں کر سکتے۔ آپ کوئی عقیدہ اختیار کرتے ہیں، کوئی طرزِ زندگی پسند کرتے ہیں، اس انتخاب کو آپ عقل کی بنیاد پر نہیں کرتے ہیں۔ کسی چیز کے حق اور ناحق ہونے کا

معیار یہ نہیں ہے کہ آپ کیا جانتے ہیں بلکہ وہ اس بات پر منحصر ہے کہ آپ اسے کیسے چنتے ہیں؟ کسی چیز کی اپنی کوئی قدر نہیں ہوتی ہے، جس انداز میں آپ اس چیز کو اپناتے ہیں وہ اس میں قدر پیدا کرتی ہے یا اس کو بے قدر بناتی ہے۔ انگریزی میں ہم اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ:

It is not important what you choose, but how you chose it.

''یہ اہم نہیں ہے کہ آپ کیا چنتے ہو بلکہ اہم یہ ہے کہ آپ کیسے چنتے ہو۔''

یہ اہم نہیں ہے کہ تم ہندو ہو یا مسلمان ہو یا لبرل ہو، کیونکہ یہ تمام طرز ہائے زندگی اور عقائد یکساں طور پر بے قدر (Valueless) ہیں۔ بلکہ جس شدت کے ساتھ آپ کسی طرز زندگی کے ساتھ بغیر کسی دلیل کے وابستہ ہو گے، اسی قدر اس طرزِ زندگی کی قدر ہو گی۔ شدتِ وابستگی کسی چیز میں قدر پیدا کرتی ہے۔ اس کو انگریزی میں کہیں گے:

Choosing passion determines your access to the good

اور اس کی معراج یہ ہے کہ جو عقیدہ اور طرزِ زندگی سب سے زیادہ لایعنی، مہمل اور عقلی طور پر تضادات کا مجموعہ ہوگا اس کو اگر اس تمام لایعنیت اور تضاداتِ عقلی کے باوجود شدت جذبات کے ساتھ یکسو ہو کر قبول کیا جائے تو یہ ایک ایسی زندگی کا اظہار ہوگا جو کہ قدرِ اعلیٰ کی اعلیٰ ترین منزل ہے۔ کرکیگارڈ کا یہ خیال بیسویں صدی میں نہایت اہم ہو جاتا ہے کیونکہ آج مغربی تہذیب کی لایعنیت مغربی مفکرین پر اظہر من الشمس ہے۔ لیکن اس لایعنیت کو اسی شدت کے ساتھ گلے لگائے رکھنے کو Authenticity کی معراج سمجھا جا رہا ہے۔

مارکس کے افکار

مارکس کو ہم کسی نہ کسی حد تک اسی تناظر میں دیکھ سکتے ہیں۔ مارکس پسند و ناپسند اور اختیار کی اس لایعنیت کو رڈ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ شوپنہار اور کرکیگارڈ کے ہاں پسند و اختیار کی لایعنیت کا جو خیال موجود ہے وہ دراصل ایک خاص معاشی نظام کی بالادستی کی وجہ سے پیدا ہوا ہے۔ اگر اس نظام یعنی سرمایہ داری کو کسی نہ کسی صورت آپ ختم کر دیں تو اس کے نتیجہ میں لایعنیت یا جسے وہ اجنبیت کا نام دیتا ہے، ختم ہو جائے گی۔

آپ جو چاہیں کریں

مارکس کی ایک سے زیادہ تعبیریں ممکن ہیں لیکن مَیں اس تفصیل میں یہاں نہیں جاؤں گا صرف چند اہم باتیں عرض کروں گا۔ مارکس کا بنیادی خیال یہ ہے کہ اختیار و پسند کی لایعنیت سرمایہ داری کا شاخسانہ ہے۔ سرمایہ داری نے پسند و اختیار کو حقیقی (Authentic) رہنے ہی نہیں دیا۔

حقیقی/ واقعی (Authentic) اختیار (Choice) کا مطلب یہ ہے کہ انسان غلام (Slave) نہ رہے بلکہ آقا (Master) بن جائے۔ آقائی اور خودمختاری کے لیے ضروری ہے کہ آپ طبقاتی جدوجہد کے ذریعہ پرولتاریوں کی آمریت قائم کریں تا کہ سرمایہ داری نظام سے اوپر اٹھ کر وہ جنت ارضی حاصل کی جا سکے جسے مارکس کمیونزم کہتا تھا۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب یہ جنت ارضی قائم ہو جائے گی اور آپ خودمختار اور آقا بن جائیں گے تو کیا آپ کو اختیار کی لایعنیت سے رستگاری نصیب ہو گی یا نہیں؟ اب اگر مارکس نے جو کمیونسٹ معاشرے کے خدوخال بیان کیے ہیں ان کا جائزہ لیں تو آپ دیکھیں گے کہ یہاں بھی اختیار کی لایعنیت عود کر آتی ہے۔ کمیونسٹ سوسائٹی وہ ہے جس میں کسی بھی چیز کی حقیقی قدر نہیں ہے۔ جس کا جو جی میں آئے کرے۔ یہی مارکس کا تصور ہے کمیونسٹ سوسائٹی کا۔ جب ہر چیز کی قدر برابر ہے (یعنی کہ کوئی قدر نہیں ہے) اور آپ جو چاہیں کریں تو اختیار کی لایعنیت کا عود کر آنا یقینی بات ہے۔ اس لحاظ سے کانٹ کی Kingdom of Ends اور کمیونسٹ سوسائٹی میں بڑی مماثلت ہے کہ دونوں میں اختیار کی لایعنیت اور اختیار کی آفاقیت عود کر آتے ہیں۔ اختیار کی آفاقیت اور اختیار کی لایعنیت ایک ہی سکے کے دو رُخ ہیں۔ جب آپ اس کے لیے تگ و دو کرتے ہیں کہ آپ جو چاہیں کریں (اختیار کی وسعت) تو کسی چیز میں بھی کوئی حقیقی قدر باقی نہیں رہتی اور زندگی فی الواقع ایک تماشہ بن جاتی ہے۔

مارکسی معاشرے میں مقصد زندگی کا تصور

اس کی واضح تصویر ہمیں مارکس کے کمیونسٹ معاشرے کے تصور میں ملتی ہے۔ کمیونسٹ معاشرے میں مارکس کہتا ہے کہ آپ کی جو مرضی میں آئے گا وہ آپ کر سکیں گے۔ صبح کو مچھلی پکڑیں، شام کو گانا گائیں وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اختیار کی لایعنیت کو ان معنوں میں رد نہیں کرتا اور

اسے ایک اچھی چیز کے طور پر قبول کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی آزادی ہے کہ جو چاہے کرے۔ اس کی نظر میں زندگی ایک کھیل ہے۔ جس میں جو دل چاہے آپ کھیلیں اور فی الواقع قدر (Value) کچھ نہیں ہے اور قدر صرف وہ ہے جو آپ چاہیں کہ قدر ہو۔ یہ تصور بعد میں دوسروں کے یہاں بھی ملتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عملاً سرمایہ داری اور اشتراکیت جو معاشرے پیدا کرتے ہیں بالکل ایک جیسے معاشرے ہوتے ہیں، ان میں کوئی فرق نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے ایک دوسرے میں ضم ہونا ان کے لیے ممکن ہے۔ اشتراکی ریاست، سرمایہ دارانہ ریاست ہو جاتی ہے اور سرمایہ دارانہ ریاست اشتراکی ہو سکتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر ان کے یہاں خیر کا کوئی تصور موجود ہی نہیں ہے۔

مابعد الطبیعیاتی سوالات کے انکار کا مکتبۂ فکر

اب چند باتیں Positivists کے بارے میں۔ Positivism ایک ایسا مکتبۂ فکر ہے جو انیسویں صدی کے اواخر میں ظہور پذیر ہوا اور اس نے حقیقت (Ontological) سے متعلق سوالوں کی ضرورت سے سرے سے ہی انکار کر دیا۔ اس نے کہا یہ بات معلوم کرنے کی کوشش کرنا کہ کائنات کیا ہے، اور انسان کیا ہے، اور حقیقت کیا ہے، لاحاصل بات ہے۔ ان حقائق تک رسائی حاصل نہیں کی جاسکتی۔ اس مکتبہ فکر میں واحد استثناء Wittgenstein کی ہے۔ (یہ بعد میں عرض کروں گا کہ Wittgenstein نے ایسا نہیں کہا کہ حقائق کے حصول کی کوشش نہیں کرنا چاہیے) سب سے اعلیٰ مقام Positivists میں Wittgenstein کا ہی ہے۔

Positivists کے مطابق Ontological حقائق کے ادراک کی کوشش کرنا فعل عبث ہے اور ہمیں اس سے باز آجانا چاہیے مثلاً یہ جو Ontological حقائق کی لوگ بات کرتے ہیں کہ انسان کیا ہے اور کائنات کیا ہے اور خیر کیا اور حق کیا ہے.... تمام چیزیں یہ سب کچھ نفسیات کاری ہے۔ یعنی انسان اپنے نفس کے اندر چند جبلتیں رکھتا ہے جن کی بنیاد پر وہ فی نفسہٖ کچھ باتیں کہتا ہے لیکن ان کی کوئی علمی حیثیت نہیں ہے اور علمی حیثیت صرف ان چیزوں کی ہے جن پر ہم منطقی ذرائع سے پہنچتے ہیں یا جو تجربات کے ضمن میں ہم جانتے ہیں۔ ماورائی حقائق

(Ontological Truth) تک ہم رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔اس چیز کے انکار کی ایک شکل Phenomenology ہے اور دوسری شکل Hermeneutics کی ہے (Hermeneutics پہلے اور Phenomenology بعد میں)۔اس میں ایک ردّعمل پیدا ہوا کہ نہیں یہ ممکن ہے.... فرض کریں ہم یہ بات تسلیم کر بھی لیں کہ ماورائی حقائق کی دسترس ہمیں اپنے نفس سے حاصل ہوتی ہے تو ہم ایسی سائنس ایجاد کر سکتے ہیں کہ جس وقت ہم انسانی تجربات کی منظم انداز میں توجیہ (Systematic Interpretation) کرنے کے قابل ہو جائیں گے تو ہم ان تجربات کے اصلی معانی بیان کر سکیں گے۔اس سائنس کو ہم کہتے ہیں (Hermeneutics) اور ہیبر ماس (Habermas) کے ہاں یہ تصور موجود ہے کہ جو کچھ بھی انسانی تصورات ہیں ان کا سائنسی، منظم اور مرتب تجزیہ حقائق کے ادراک کا ایک صحیح ذریعہ ہو سکتا ہے۔اس میں کچھ مفکرین نے بالخصوص Dilthey نے اس خدشے کا اظہار کیا کہ تجربے تو انسان کے تاریخی تناظر اور تاریخی پوزیشن سے متعین ہوتے ہیں۔لہٰذا ان تجربات کا تجزیہ اس چیز کا امکان رکھتا ہے کہ حقائق کا مختلف النوع ادراک کیا جائے۔

اضافیت (Relativism) کے مطابق کوئی بھی ادراک آفاقی حقائق کو اُجاگر نہیں کرتا بلکہ وہ ایک ایسے سچ کو اُجاگر کرتا ہے جو صرف اضافی طور پر درست ہوتا ہے۔مخصوص تجربات کے تاریخی سیاق وسباق کے حوالے سے صداقت متعین کی جاسکتی ہے جس کی وجہ سے ہم آفاقی سچائیوں کا ادراک علم التعبیر اور علم توجیہہ کے ذریعے نہیں کر سکتے اور Hermeneutics میں یہ گنجائش موجود ہے کہ اضافیت دوبارہ کسی نہ کسی شکل میں امکان کے طور پر وجود رکھے۔مغربی تہذیب کا بنیادی دعویٰ یہ ہے کہ وہ ایسے مصدقہ اصول دریافت کر سکتی ہے کہ جن کی بنیاد پر تمام معاشرے اور تمام ریاستوں کے نظام کو مرتب کریں تو عدل قائم ہو جائے گا۔مغربی تہذیب کی فلسفیانہ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ عدل کا تصور، تصورِ نفس سے اخذ کردہ ہے جب کہ تصورِ نفس، تصورِ عقلیت میں مضمر ہے جس کا پرچار کانٹ اور ہیگل وغیرہ کی فکر میں ملتا ہے۔اگر اضافیت کو قبول کر لیا جائے تو مغربی تہذیب کی آفاقیت خطرے میں پڑ جائے گی یعنی مغربی تہذیب وہ اصول تو مرتب

کر سکتی ہے جو اس کے اپنے تاریخی اصولوں سے متعین ہوتے ہیں لیکن ایسے اصول وہ نہ تخلیق کر سکتی ہے نہ متعین کر سکتی ہے جو تمام معاشروں اور تمام تاریخوں کے لیے یکساں طور پر محیط ہوں اور ان کی بنیاد پر ان تہذیبوں کو اور ان کے تجربات کو جانچا جا سکے۔ لہٰذا Relativism، مغربی تہذیب کی آفاقیت کے لیے ایک خطرہ ہے۔ یہ وہی مغربی بالادستی کی قنوطی (Pessimistic) تعبیر ہے جو شوپنہار سے شروع ہوتی ہے۔ اس کی ایک تشریح بعد میں فوکو جیسے Structralist کے ہاں ملتی ہے جسے ہم Post Moderm تحریک کہتے ہیں اور جو زیادہ واضح شکل میں نمایاں ہوتی ہے۔

نطشے اور برگساں: حق کی بجائے غلبہ

نطشے (Nietzsche) اور برگساں بھی دو اہم فلسفی ہیں۔ ان کے ہاں بھی وہی تسلسل افکار (Continuation) موجود ہے کہ مغربی تہذیب کی بالادستی کو آفاقی اصولوں کی بنیاد پر ثابت (Justify) کیا جائے، لیکن اس طریقے سے کہ مغرب کو ایک فاتح کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ نطشے کے ہاں جو بنیادی تصور ملتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک ایسا قانون موجود ہے جو تمام انسانیت پر لاگو ہے وہ اس اصول کو The Will to Survive یا Power کا نام دیتا ہے۔ اس سے مراد ہے کہ ہر آدمی، ہر فرد، ہر معاشرہ اس بات پر مجبور ہے کہ اپنی بقاء (Survival) کے لیے جدوجہد اور جستجو کرے۔ جو چیز اہم ہے وہ یہ نہیں ہے کہ ہم حق تک رسائی حاصل کریں۔ یہ ضمنی سوال ہے کہ ہم حق تک کتنی رسائی حاصل کر سکتے ہیں۔

اصل اہمیت حق کی نہیں غلبہ کی ہے

اصل سوال یہ ہے کہ ہمیں غلبہ حاصل ہوتا ہے یا نہیں ہوتا، اور یہ کہ ہم Survive کر سکتے ہیں یا نہیں؟ Super Man وہ شخص ہے جو زندگی کو اس طریقے سے گزارتا ہے کہ وہ غالب (Super Dominant) حیثیت اختیار کر لیتا ہے اور وہ اس اخلاقیات (Morality) کو عام کرتا ہے جو غلبہ پانے والے (Master) کی اخلاقیات (Morality) ہوئی ہے۔ غلام کی اخلاقیات (Morality) نہیں ہوتی۔ دراصل کوشش، جدوجہد اور تجزیے کا مرکز و محور یہ ہونا

چاہیے کہ ہم کس حد تک ایک غلام نسل (Slave Race) پر غالب آسکتے ہیں اور ہم کس حد تک اپنے ارادے کو مسلط کر سکتے ہیں اور ہم اپنی زندگی کو ایک ادب کے نمونے (Work of art) کی طرح گزار سکتے ہیں۔ زندگی میں جس چیز کی تلاش ہے وہ حسن کی تلاش ہے اور حسن کی تحسین وتعریف ہے۔ زندگی ادب کا ایک نمونہ ہونی چاہیے۔

اخلاقی سوالات اصل سوالات نہیں

اخلاقی سوالات اصل سوالات نہیں ہیں۔ اصل سوالات تو یہ ہیں کہ ہم کتنے جمالیاتی (Artistic) معاشرے تخلیق کرتے ہیں یا زندگی گزارتے ہیں اور جس کے نتیجے میں ہم ایک نظام کے اندر کتنا زیادہ غلبہ حاصل کرتے ہیں اور کس حد تک ہم اس قابل ہوتے ہیں کہ اپنی شخصیت کو غالب کر سکیں اور اپنی تہذیب کو غالب کر سکیں۔ ایک پورے معاشرے کے اوپر اس کے حساب سے ہم بقاء (Survive) حاصل کریں اس کے سوا حق کی کوئی اصل نہیں۔

خواہشات نفس ہی 'حق' ہیں

Phenomenology کے بارے میں کچھ باتیں الگ سے بھی عرض کر سکتے ہیں لیکن میرے خیال میں باقی تمام چیزیں حذف کر کے صرف اتنی بات کافی ہے کہ Phenomenology وہ ہے جو انسان کے اندر سے نکلتی ہے۔ انسان کو حق اپنے اندر ہی تلاش کرنا ہے۔ حق کے تلاش کرنے کی جگہ Self ہے (The Self must find in itself)۔ چنانچہ معروضیت (Objectivity) کا حصول اسی وقت ہوتا ہے جب انسان مکمل طور پر داخلی (Totally Subjective) ہو جائے۔ جس وقت ایک شخص پورے طور پر اپنے آپ کو اپنے نفس کے سپرد کر دیتا ہے اور اپنے نفس کی کیفیات کا ادراک کر لیتا ہے تو اس وقت ہی وہ حق کا ادراک کرتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ نفس کوئی عابد نفس نہیں ہے۔ وہ نفس نہیں ہے جو کسی ربّ کے ماتحت ہے، بلکہ جو خود ہی ربّ ہے اور جو خود ہی حق کا خالق ہے، خود ہی حق کا مالک ہے اور اس کا ادراک جب آپ پورے طریقے سے کریں گے اسی وقت خود ارادیت کا کوئی مطلب نظر آتا ہے چنانچہ Phenomenology کی یہ تعلیم کہ انسان اسی وقت حق کا ادراک کرتا ہے جس وقت وہ نفس کے تابع ہو جاتا ہے یا نفس کو پورے طریقے سے سمجھتا ہے تو یہ وہی چیز ہے کہ جو کانٹ کے ہاں کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے کہ

Order نفس کے اندر پہلے سے موجود ہے۔

فرائیڈ کے یہاں حق کا مقام تحت الشعور ہے

اس کے بعد انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے شروع میں جو فلسفی بہت اہم رہا وہ فرائیڈ ہے۔ فرائیڈ کے ہاں یہ تصور کہ نفس کے اندر سے ہی حق کا ادراک نکلتا ہے پورے طریقے سے واضح ہو کر آتا ہے۔ وہ تصور یہ ہے کہ حق کا اصلی مقام تحت الشعور (Sub-conscious) ہے۔ تحت الشعور میں جو قوت غلبہ پاتی ہے جو طاقت غالب آتی ہے اس کو فرائیڈ "Libido" کہتا ہے لیکن Libido ایک تباہ کرنے والی اور حیوانی خصوصیت ہے۔ جس وقت آپ اپنے آپ کو نفس کے سپرد کرتے ہیں اور تحت الشعور میں نفس کو تلاش کرتے ہیں تو وہ حق جس کا ادراک کرتے ہیں شیطانی ہے۔ آپ کی [Idis Impulses] جب آپ کائنات کو دیکھتے ہیں، اس کی اصلیت جانتے ہیں تو پتا چلتا ہے کہ یہ کائنات تو شیطانی ہے۔ یہ کائنات تو جنگلی ہے۔ یہ کائنات تو بہیمیت کی غماز ہے۔ چنانچہ تہذیب کو قائم کرنے کے لیے لازم ہے کہ نفس (ego)، لبیڈو (Libido) پر غالب آئے۔ اگر Ego، Libido پر حاوی نہیں ہوگا تو تہذیب برقرار نہیں رہ سکتی چونکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ ایک حیوان ہیں۔ حقیقت تو یہ ہے کہ آپ کے اندر جو خواہشات اور میلانات ہیں وہ تہذیب کش ہیں اور تہذیب کو تباہ کرنے والے ہیں۔ چنانچہ حق کو جاننا اس چیز کو جاننا ہے کہ کائنات شیطانی ہے اور انسان کی اپنی ماہیت شیطانی ہے اور تہذیب کا قیام اسی شیطان کے خلاف ایک جدوجہد ہے اور ان معنوں میں وہ کامیاب نہیں ہوسکتی کہ جس وقت آپ اپنی اصلیت کو دبا (Suppress) دیتے ہیں، جس وقت Ego، Libido پر حاوی ہوگا تو آپ دراصل اپنی ذات کی نفی کریں گے اور موت کی خواہش آپ کے اوپر حاوی ہو جائے گی۔ چنانچہ شوپنہار کے ہاں تصور چلا آ رہا ہے کہ بنیادی طور پر Will شیطانی چیز ہے، یہ تصور فرائیڈ کے ہاں پوری طرح منعکس ہوتا ہے۔ لہٰذا وہ کہتا ہے کہ ہم نے اپنے نفس کو دیکھا اور دیکھا کہ نفس خود ارادیت کے اظہار کا نام ہے اور خود ارادیت تو Libido یعنی (Idis Impulses کا اظہار) اور وہ خواہشات جو انسان کو حیوان بناتی ہیں، کے اظہار کا طریقہ ہے اور تہذیب تو وہ ملمع ہے جس کے اندر وہ چیزیں محصور رہتی ہیں (جاری ہے)۔

تفہیم دین

وحید مراد[۱]

جدیدیت اور روایت - قدیم بحث، عصری تناظر[۲]

جدیدیت کیا ہے؟

جدیدیت (ماڈرنائزیشن) کی ابتداء مغرب (یورپ) میں ہوئی اور پھر یہ دنیا کے دیگر خطوں میں پھیلتی چلی گئی۔ جدیدیت اصطلاح سے زیادہ ایک خاص رویے، طرز فکر، مزاج اور اسلوب کا نام ہے۔ اس میں عقل کو امام تصور کیا جاتا ہے اور تمام چیزوں کو عقل محض کی روشنی میں جانچا، پرکھا اور برتا جاتا ہے حتیٰ کہ وحی الٰہی، ذات خداوندی اور ذات پیغمبر بھی صرف اور صرف عقل کی کسوٹی پر پرکھے جاتے ہیں۔

جدیدیت میں عام رجحان سیکولرائزیشن کا ہی ہوتا ہے۔ جدیدیت کے بڑے مسلم مفکرین سر سید اور مفتی عبدہ سیکولر نہیں تھے لیکن ان کے شاگردوں، حامیوں اور معتقدوں کی دوسری نسل مصر اور ہندوستان میں سیکولر بن کر سامنے آئی۔ نیز خوارج سے لے کر آج تک جدیدیت پسند گروہوں کی اکثریت ہمیشہ اسلامی روایت کے مدمقابل اور غیر دینی قوتوں کی فطری حلیف رہی ہے۔

مصر کے حسن العطار، محمد عبدہ، جمال الدین افغانی اور سر سید سے لے کر غلام احمد پرویز تک، سب کے نزدیک جدیدیت کی ایک ہی تعریف ہے کہ قرآن، سائنس اور فلسفے میں کوئی تضاد نہیں۔ مسلمانوں کے زوال کا سبب مادی ترقی میں انحطاط یعنی سائنس اور ایجادات سے محرومی ہے اور امت مسلمہ کا عروج اسی طرح ہوگا جس طرح مغرب میں ہوا۔ سائنس یونان سے عرب، عربوں سے اسپین اور وہاں سے یورپ منتقل ہوئی۔ یہ ثقافتی نفوذ تا حال قائم ہے۔ ان کے خیال میں قرآن طبیعیاتی اور ریاضیاتی علوم کے متعلق معلومات سے بھرا ہوا ہے۔

مسلم جدیدیت پسندوں کا تمام زور اس بات پر ہے کہ قرآن کے مفاہیم سمجھنے کے لیے

---

[۱] کراچی

[۲] یہ مضمون کراچی یونیورسٹی کے شعبہ تصنیف و تالیف و ترجمہ کے تحقیقی میگزین 'جریدہ' (ایڈیٹرز سید خالد جامعی و عمر حمید ہاشمی) سے استفادہ پر مبنی ہے جس کی تفصیل مضمون کے آخر میں دی گئی ہے۔

بیرونی وخارجی ذرائع کی ضرورت نہیں۔اس استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ قرآن کو صاحب قرآن کے بغیر بھی سمجھا جا سکتا ہے یعنی قرآن اور صاحب قران دو الگ الگ چیزیں ہیں۔اس نقطہ نظر کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان اپنی تاریخ،روایات،اقدار اور اس طرز عمل سے رشتہ منقطع کر لیں جو تسلسل کے ساتھ امت کو مختلف ذرائع سے ملتا رہا۔یہ بالکل وہی نقطہ نظر ہے جو مارٹن لوتھر نے پروٹسٹنٹ تحریک کے لیے اختیار کیا تھا اور جس کے نتیجے میں یہ عیسائیت کے لیے موت کا پیغام بنا۔مسلم معاشروں کے تمام جدیدیت پسندوں کے افکار میں درجہ ذیل امور جزوی یا کلی طور پر پائے جاتے ہیں۔

جدیدیت ایک عالمگیر تہذیب،ثقافت و اقدار کا دعویٰ کرتی ہے جس کی بنیاد عقل پرستی پر ہے۔یہ اپنے عہد کے غالب رجحانات سے مرعوب ہو کر فلسفہ و سائنس کو دین کا ہمسر بلکہ اس سے بھی اعلیٰ سمجھتی ہے۔

جدیدیت کی دلچسپی کے خاص میدان تسخیر کائنات اور مادی ترقی ہے لیکن انسان کے اخلاقی وروحانی وجود،تبلیغ ودعوت دین سے اسے کوئی دلچسپی نہیں۔اس کے نزدیک روحانیت صرف چند رسوم ورواج مثلاً نکاح،طلاق،تجہیز وتکفین میں باقی رہ گئی ہے۔ یہ ایسی شخصیت کی تعمیر وتشکیل چاہتی ہے جس کا مقصد دنیا کی زندگی کو زیادہ سے زیادہ خوشگوار بنانا اور زیادہ سے زیادہ وسائل سمیٹنا ہے۔یہ اس زمین کو جنت بنانے کی تگ ودو میں ہے اور آخرت کی جنت اس کے یہاں محض خیالی اور تمثیلی ہے اس لیے موت اور قیامت کے موضوعات سے بھی اسے کوئی دلچسپی نہیں۔

جدیدیت قرآن کو مجرد کتاب تصور کرتے ہوئے لفظیت پر اصرار کرتی ہے۔قرآن،سنت و حدیث کے الفاظ کو لغت،محاورہ عرب اور زمان و مکان میں محصور سمجھتی ہے اور اسوۂ رسالت مآب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور عمل صحابہ کرامؓ کو اہمیت نہیں دیتی۔جدیدیت کے خیال میں قرآن وسنت کی نئی تشریحات ضروری ہیں کیونکہ قدیم تشریحات صرف عرب کے معاشرتی تناظر میں کی گئی تھیں اور آج وہ قابل عمل نہیں۔جدیدیت پسند اس حقیقت کو سمجھنے سے قاصر ہیں کہ قرآن ایک خاص زمانے میں ایک خاص ہستی پر ایک خاص ترتیب کے ساتھ نازل ہوا۔اگر قرآن،کتاب اللہ ہے تو مجسم کتاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں۔

تمام جدیدیت پسند، مسلمہ عقائد اور حدیث کا مکمل یا اس حصے کا انکار کرتے ہیں جو ان کے نظریات کی توثیق نہ کرتا ہو اور ان احادیث کو قبول کرتے ہیں جو ان کے افکار کی تائید، تصدیق و توثیق پر مبنی ہوں۔ بعض اوقات واضح انکار کے بجائے تحریف اور تاویل سے کام لیتے ہیں۔

جدیدیت کا خاص وصف اجتہاد کے نام پر اجماع اور سلف سے انحراف، تفکر و تدبر کے نام پر دینی اقدار، روایات، مدارس، اور علماء کی تضحیک۔ عروج و زوال کی بحثوں میں سائنس، ٹیکنالوجی و عقل سے انحراف کو زوال کی وجہ قرار دینا، روحانیت اور تصوف کو مادی ترقی میں رکاوٹ قرار دینا ہے۔

جدیدیت کی ایک ایسی شکل بھی ہے جو قرآن و سنت کو ماخذ دین سمجھنے کے باوجود کمیونزم، سوشلزم، مغربی نظام فلاح میں اسلام کی پیوند کاری کرتی ہے اور اس کی بڑی وجہ مغربی فکر و فلسفے سے عدم واقفیت ہے۔

عہد حاضر کے جدیدیت پسند، مغربی تہذیب و افکار کی اسلام کاری میں مصروف ہیں۔ وہ ان اقدار کو اسلامی معاشروں میں عام کرنے اور ان کی اجنبیت ختم کرنے کے طریقے تلاش کر رہے ہیں۔ ان میں معذرت خواہی کے مختلف گروہ اور رنگ پائے جاتے ہیں جو مغربی طرز زندگی، طرز فکر، طرز تعلیم کو اسلامی علمیاتی فکر میں سمونے اور جواز پیش کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں۔

قرون اولیٰ کی جدیدیت

قرن اول میں جدیدیت کا ظہور مذہبی و سیاسی فرقوں کی شکل میں ہوا۔ خوارج وہ پہلا فرقہ ہے جس نے عقل کی بنیاد پر اپنے نقطہ نظر کی اساس قائم کی اور پھر عقل کے سہارے مختلف قضایا قائم کرتے چلے گئے۔ ان عقلی موشگافیوں کے ذریعے شریعت اور عقائد میں اختراعات، بدعات و تنازعات کا ایک سلسلہ در آیا جس نے فلسفہ یونان کی آمیزش کے ساتھ ایک مجتہدانہ اور عالمانہ رنگ اختیار کر لیا۔ تفریق و افتراق کے اس سلسلے میں رکاوٹ بننے والے کئی صحابہ کرام کو شہید کیا گیا۔ حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ کی شہادت بھی اسی سلسلے کی کڑیاں ہیں۔

پہلی اور دوسری صدی ہجری میں عقلی موشگافیوں اور نسل پرستی کی بنیاد پر جو فرقے سامنے آئے ان کے فروغ کا سبب قرآن و سنت اور اجماع سے احتراز، انکار اور انحراف تھا۔ ان کی

تفصیلات شہرستانی اور ابن حزم اندلسی کی کتب 'الملل والنحل' اور کئی دیگر کتب میں موجود ہیں۔ ان میں سے چند اہم فرقے اور افراد درج ذیل تھے:

خوارج، معتزلہ، مرجئہ، قدریہ، جہمیہ، اخوان الصفاء اور ان کے ذیلی فرقے

سرکردہ افراد میں معبد الجہنی، غیلان دمشقی، عطاء ابن السیار، واصل بن عطا، عمرو بن عبید، جہم بن صفوان، ابو ہذیل بن حمدان علاف، ابراہیم بن سیار، ابوالحسن الخیاط و دیگر۔

فلاسفہ میں الکندی، ابوبکر رازی، ابولعلاء معری، عمر خیام، فارابی، ابن سینا، مسکویہ، ابن باجہ، ابن طفیل، ابن رشد اور دیگر۔

قرون اولیٰ کی جدیدیت کا محاکمہ

قرون اولیٰ کی جدیدیت کا علمی محاکمہ اور ازالہ کرنے میں تمام علماء کرام نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ شہرت امام ابوالحسن الاشعری اور امام غزالی کو حاصل ہوئی۔ ابوالحسن الاشعری نے معتزلہ کو علمی بنیادوں پر شکست دی اور امام غزالی نے یونانی فلسفہ کی یلغار کو اس طرح روکا کہ پھر اٹھارویں صدی عیسوی تک عالم اسلام میں جدیدیت سر نہ اٹھا سکی۔

امام غزالی کے نزدیک علم کا مقصد محض خدا کی رضا، خوشنودی اور خوف خدا کا حصول ہے۔ علوم نقلی ہوتے ہیں اور فنون عقلی۔ علوم کی بنیاد وحی پر ہوتی ہے جسے عقل محض سے پرکھا نہیں جا سکتا۔ فنون عقلی موشگافیوں سے ترقی کرتے ہیں لیکن انہیں بھی لہو ولعب اور لغو نہیں ہونا چاہیے۔ جو فنون خدا کی خوشنودی، رضا، خوف خدا، معاد اور معاش کے فروغ میں معاون ہوں گے وہ فنون کہلائیں گے۔

جدیدیت پسند اجتماعی طور پر امام غزالی اور ابوالحسن الاشعری کو نظر انداز کرتے ہیں کیونکہ وہ مغرب کو قبول کرنے کی راہ میں سب سے بڑی علمی رکاوٹ ہیں۔ انہوں نے اسلامی معاشروں میں الحاد، لادینیت، اور آزاد خیالی کے تمام راستے محدود و مسدود کر کے رکھ دیے۔ جدیدیت پسند معتزلہ، ابوبکر رازی، کندی، فارابی، ابن سینا، اخوان الصفاء اور ابن رشد کو اسلامی تاریخ کے سنہرے دور کے طور پر پیش کرتے ہیں حالانکہ ان میں سے اکثر کے خیالات یہ تھے کہ زمین و آسمان ہرگز تباہ نہیں ہو سکتے، جنت و جہنم کی لذت و سزا جسمانی نہیں ہو گی۔ ان کے نزدیک اہل علم

اور اہل حکمت وفلاسفہ کو بھی نبیوں میں شمار کیا جا سکتا ہے، انسانوں میں سب سے افضل اصحاب عقل ہوتے ہیں، سقراط اور زرتشت پیغمبر تھے۔ سواد اعظم اہلسنت کی روایت کے مطابق ان فلاسفہ کے یہ افکار گمراہ کن ہیں:

جن لوگوں نے جدیدیت کا علمی محاکمہ، مقابلہ اور ازالہ کیا ان میں سے چند مشہور علماء کرام درج ذیل ہیں۔

امام ابوحنیفہ (الفقہ الاکبر)، امام شافعی (الرسالہ، کتاب الام) امام ابوالحسن الاشعری (مقالات الاسلامیین)، قاضی ابوبکر باقلانی۔

امام غزالی (تہافتہ الفلاسفہ، المستصفیٰ)، امام فخر الدین رازی، امام نجم الدین نسفی (مقدمہ فی بیان المذاہب) ابن تیمیہ (الرد علی المنطقیین، منہاج السنہ)۔ علامہ سعد الدین تفتازانی، امام الحرمین، امام طحاوی (عقیدہ طحاویہ)، امام سرخسی، شاہ ولی اللہ اور دیگر علماء کرام۔

اٹھارویں صدی کی جدیدیت

مغرب میں یونانی فلسفہ ابن رشد کے ذریعے پہنچا اور پھر مغرب نے اس میں اضافے کر کے سترھویں صدی میں جدید فلسفۂ مغرب اور سائنس کی بنیاد رکھی۔ اس کے نتیجے میں یورپ نے مادی ترقی کے نئے مظاہر پیش کیے۔ عالم اسلام میں اس وقت انحطاط کے باعث کوئی بڑی علمی ہستی موجود نہ تھی لہذا مغربی فلسفیانہ یلغار اور مادی ترقیات نے عالم اسلام کو متاثر کیا۔ ترکی، مصر اور ہندوستان اس فکری، علمی اور ثقافتی یلغار سے سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ استعماری طاقتوں کے ذریعے جدیدیت کی لہر جب ان ممالک میں داخل ہوئی تو مسلم مفکرین نے اسے محض ایک اتفاقی حادثہ سمجھا۔ کچھ لوگوں نے مرعوب و مغلوب ہو کر اس یلغار کے تمام ثقافتی، فلسفیانہ اور علمیاتی پہلوؤں کو بغیر نقد و نظر، محاکمے و مباحثے کے، اسلام کے سنہری دور کا انعکاس و عکاس سمجھ کر من وعن قبول کر لیا۔ مسلمان مفکرین کی توجہ مغرب کی ترقی اور برتری پر مرکوز ہو گئی اور مسلمانوں کے زوال کا واحد سبب مادی علم، ہنر، فنون، ترقی اور تسخیر دنیا میں پسپائی کو قرار دیا گیا۔ عروج کے لیے طاقت، علم، قوت، سائنس، اقتدار کو اہداف ٹھہرایا گیا۔

اسلامی تاریخ اس بات کی شاہد ہے کہ سلطنت روما اور ایران کو ٹیکنالوجی کے بل بوتے پر

شکست نہیں دی گئی تھی بلکہ فتح کرنے والے گھوڑوں پرسوار تھے اوران کی دعوت نے صرف زمین ہی نہیں بلکہ قلوب بھی مسخر کر لیے تھے۔ ایمان ایک قلبی کیفیت ہے جو روحانی واردات سے متاثر ہوتی ہے۔ مادی مظاہر سے ایمان وعقیدے کی دولت نصیب نہیں ہوتی۔ اندلس میں مسلمانوں نے زبردست مادی ترقی کی لیکن روحانی طور پر وہ غیر مسلموں کو متاثر نہ کر سکے لہذا ہمیشہ اقلیت میں رہے۔ اندلس کی مادی ترقی، سائنس، فلسفہ اورفن تعمیرات نے یورپ میں اشاعت اسلام، اس کے اثر ونفوذ اور مسلمانوں کو بچانے میں کوئی کردار ادا نہیں کیا۔ خلافت عثمانیہ اور مغل سلطنت بھی اپنے زیر تسلط علاقوں میں اسلام کی اشاعت پر توجہ نہ دی سکیں اس لیے مادی طور پر مستحکم ہونے کے باجود رعایا پر روحانی برتری قائم نہ کرسکیں۔ انہوں نے زمین مسخر کی لیکن دلوں کو مسخر نہ کر سکے۔

جدید مفکرین کے تجزیوں میں اشاعت اسلام اور روحانیت زیر بحث نہیں آتی، وہ یہ بتانے سے قاصر ہیں کہ سائنسی تمدن کی حامل خلافت عباسیہ غیر متمدن منگولوں سے شکست کیسے کھا گئی؟ پھر شکست خوردہ اسلامی تہذیب صرف پچاس سال کے عرصے میں مزید مادی ترقی کیے بغیر دوبارہ کیسے غالب آ گئی؟ وہ کونسا فلسفہ، سائنس یا ٹیکنالوجی تھی جس سے متاثر ہوکر چنگیز خان کے پوتے نے اسلام قبول کیا؟

انیسویں صدی کی جدیدیت

انیسویں صدی میں جدیدیت کا باقاعدہ آغاز مصر میں حسن العطار اور رفاع رافع نے قوم پرستی اور لبرل فکر کے ذریعہ کیا لیکن اس سے قبل محمد علی پاشا مملوکوں کے قتل عام سے شروعات کر چکے تھے۔ ابراہیم شناسی اور نامق کمال نے اسے آگے بڑھایا۔ جمال الدین افغانی نے رفاع کی فکر میں توسیع کرتے ہوئے مسلم قومیت کے تصور کو پان اسلام ازم کے سانچے میں ڈھالا اور جدیدیت کے زیر اثر، امت کے تصور کو پس پشت ڈال کر قومیت کے فلسفے کو مذہبی وعلمی بنیاد مہیا کی جس کا کام تحفظ ذات اور قومی مفادات کے تحفظ کے سوا کچھ نہ رہا۔

انیسویں صدی کے وسط میں جب ترکی، مصر اور ہندوستان پر جدیدیت کا زبردست حملہ ہوا تو تین اہم مفکرین جمال الدین افغانی، مفتی عبدہ اور سرسید احمد خان سامنے آئے۔ تینوں حضرات مغربی فلسفے سے سرسری واقفیت اور سائنسی مباحث پر برائے نام عبور رکھتے تھے۔ مغرب کی مابعد

الطبیعیات، وجودیات، کونیات، الہیات اور فلسفیانہ تحریکوں سے بھی پوری طرح واقفیت نہیں تھی۔ وہ تہذیبِ مغرب کو اسلام کا مظہر سمجھتے رہے حالانکہ تحریک تنویر اور تحریک رومانویت کی علمیات، عقل استقرائی و استخراجی اور وجدان کو حقیقت کلی تک پہنچنے کا اصل ذریعہ سمجھتے ہوئے کسی خارجی ذریعہ علم (وحی الٰہی) کی قائل نہ تھیں۔

مفتی عبدہ انگریز فلسفی ہربرٹ اسپنسر کے مداح تھے۔ انہوں نے تقلید کی مخالفت کی، اجتہاد پر زور دیا، اجماع کا براہ راست انکار کرنے کے بجائے پارلیمنٹ کو اجماع کا متبادل قرار دے کر جمہوریت کو اسلامی رنگ دینے کی کوشش کی اور مارٹن لوتھر کے نقطہ نظر کی توثیق کی۔ مفتی عبدہ نے لکھا تھا کہ اللہ تعالیٰ کا عرفان جدلی معقولات سے نہیں بلکہ مطالعہ فطرت سے ممکن ہے۔ اللہ نے دو کتابیں نازل کیں ایک 'مخلوق کتاب' ہے جس کو 'فطرت' کہتے ہیں دوسری الہامی کتاب جو 'قرآن حکیم' ہے۔ سرسید نے اسی نقطہ نظر کو کلام الٰہی (word of God) اور کائنات (work of God) کے پیرائے میں بیان کیا اور اجماع کو ماخذ قانون تسلیم کرنے سے انکار کیا۔ مفتی عبدہ کی بیس تصانیف میں سے کوئی بھی مغربی فلسفہ، تہذیب اور اقدار کا نہ احاطہ کرتی ہے نہ تنقید۔ یہی حال سرسید کا ہے جن کے یہاں فلسفہ مغرب کی مبادیات کے بارے میں کوئی آگہی نہیں ملتی۔ انہوں نے صرف کرامت علی جونپوری کے خیالات کو ہی اپنے انداز سے پیش کیا۔

جدیدیت پسند مفکرین کی کتابوں میں بنیادی انسانی حقوق، جمہوریت اور دستوری ریاست کے مباحث پر بھی گفتگو اور تجزیے نظر نہیں آتے۔ انہوں نے کبھی اس بات پر غور نہیں کیا کہ بنیادی حقوق انسانی کا فلسفہ کہاں سے آیا؟ کن لوگوں نے تخلیق کیا؟ اس کے ذرائع اور مآخذ کیا ہیں؟ جن اصولوں، اقدار، روایات کو عالمی، مسلمہ، مستند اور ناقابل تغیر قرار دیا جا رہا ہے وہ کن ذرائع سے حاصل ہوئے؟ انہیں پوری دنیا سے منوانا کیوں ضروری ہے؟ انسان اگر عبد ہے تو اس کے پاس 'جو چاہے اختیار کرے' کا اختیار کیسے آسکتا ہے؟ کیا مطلق آزادی کا مطلب سرمائے کی غلامی اور شیطان کی بندگی ہے؟ کیا دستوری ریاست کی حکمرانی کا مقصد سرمایہ دارانہ اقلیت کی حکمرانی ہے؟

مغرب کے تمام جدید علوم میں عقلیت (Rationalism) ہی وہ بنیادی عنصر ہے جس نے ہر چیز کا احاطہ کیا ہوا ہے۔ اس نقطہ نظر کے مطابق انسان قائم بالذات ہے، اپنی عقل، خواہش

اور مرضی کے مطابق فیصلے کرنے میں بالکل آزاد اور حق بجانب ہے۔ جو چیز عقل اور تجربیت کی گرفت میں نہ آئے اور ان کے ذریعے جس کی تصدیق نہ ہو سکے وہ بے حقیقت اور اس کا انکار لازم ہے۔ یہ فکر بعد ازاں مربوط سائنسی فکر (Scientific Method) میں تبدیل ہوئی۔ جدید مسلم مفکرین اس سے متاثر ہوئے اور انہوں نے اسلام کو بھی اسی سائنٹفک میتھڈ سے سمجھنے کی کوشش کی۔ لیکن انہوں نے اس حقیقت کو پیش نظر نہیں رکھا کہ اس عقلیت کے پس منظر میں انسان پرستی کا فلسفہ کارفرما ہے جس میں کائنات کا مرکز اللہ تعالیٰ کے بجائے انسان کو ٹھہرا کر اسے مطلق اختیارات کا مالک قرار دیا گیا۔ انسان کو جس منصب پر فائز کیا گیا وہ عبد نہیں بلکہ معبود کا مقام ہے۔ انسان دوستی، حقوق انسانی اور انسان پرستی کے اس فلسفہ کی رو سے نفس انسانی نے وحی الٰہی اور عقل انسانی نے پیغمبروں کی جگہ لے لی۔ اس کے نتیجے میں جو انسان وجود پذیر ہوا وہ خواہشوں کا غلام، مطلق آزادی کا طلب گار ہے اور آزادی کی مادی شکل سرمائے کے سوا کچھ نہیں۔ اس حب دنیا و لذت پرستی کے لیے تسخیر دنیا ضروری ہے تاکہ سرمایہ میں بڑھوتری ہو اور ہر خواہش پوری ہوتی رہے۔

جدیدیت پسندوں کا دعویٰ ہے کہ جدید مغربی تمدن، اسلامی تہذیب ہی کی توسیع ہے۔ عالم اسلام نے اپنی میراث یعنی سائنس، ترقی، ڈیولپمنٹ اور عقل کو چھوڑ دیا، مغرب نے اسے اختیار کر کے ترقی کی منازل طے کر لیں لہٰذا مغرب سے ہمیں اپنا تاریخی ورثہ واپس لے کر ایک نئی دنیا کی تعمیر کرنی چاہیے۔ ان مفکرین کے ہاں دعوت ایمان، قلوب کی تسخیر، دین کے لیے محنت، پیغام محبت، عمل صالح، اتحاد، اجماع، اور جہاد جیسے روحانی اعمال کی کوئی اہمیت نہیں۔ ان کے نزدیک فتح کا واحد راستہ مادی ترقی، جنگ، پیسہ، اور مادی علم ہے۔ ان افکار کی وجہ سے امت سمٹ کر قوم پرستی کے دائرے میں مقید ہو گئی۔ قومیت آفاقیت کی نفی کرتی ہے اور زمان و مکان کے دائرے میں محصور ہوتی ہے جبکہ اسلام قومیت کی نفی کرتے ہوئے امت کی تشکیل کرتا ہے۔ قومیت کی بنیاد محبت نہیں نفرت پر ہوتی ہے اور اس میں ذات رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے اسوہ حسنہ، مقام رسالت، سنت و حدیث سے فیض یاب ہونے کی بجائے اسے نشانہ بنایا جاتا ہے۔ یہی وہ سرچشمے ہیں جہاں سے اسلامی تہذیب، تاریخ، حکومت اور تمدن کے سرچشمے پھوٹتے ہیں، ان کو گدلا کیے بغیر جدیدیت عالم اسلام میں برگ و بار نہیں لا سکتی۔

مسلم دنیا میں جدیدیت کو فروغ دینے والے مفکرین

مصر میں حسن العطار، رفاع رافع، مفتی عبدہ، علی عبدالرازق (مفتی عبدہ کے شاگرد)، صحی محمصانی، عبدالحلیم محمود، ذکی نجیب محمد، محمد حسین ہیکل، ڈاکٹر احمد امین مصری، محمد ابورایہ، ڈاکٹر طہ حسین ودیگر۔

ترکی میں سلطان سلیم ثالث، محمود ثانی، غازی مختار احمد پاشا، مصطفیٰ کمال اتاترک، ضیاء گوگلپ، شیخ احمد آفندی ودیگر۔

ایران میں ڈاکٹر علی شریعتی، ڈاکٹر حسین دباغ، عبدالکریم سروش، ڈاکٹر حسین نصر، ڈاکٹر ولی رضا نصر ودیگر۔

عراق میں داؤد محمد پاشا، محمد رشاد پاشا، مدحت پاشا اور حمدی البشاشی، شیخ محمد حسین نینی نے جدیدیت کو فروغ دیا۔

شام میں علامہ طاہر الجزائری، لیبیا کے کرنل معمر قذافی۔ لبنان کے امیر شکیب ارسلان۔

افغانستان میں جمال الدین افغانی، نیاز احمد زکریا۔ ملائیشیا میں مہاتیر محمد، انور ابراہیم۔

تیونس میں حسین بے، شاکر بے، احمد بے اور خیر الدین پاشا۔ مراکش میں عبداللہ لاروئی، سوڈان میں عبداللّٰھی احمد النعیم، ڈاکٹر حسن الترابی۔

فرانس کے یحیٰ نور الدین (رینے گینوں) اور انکا حلقہ جس میں شواں، گئے ایتیون، مارٹن لنگز وغیرہ شامل ہیں اس مکتبہ فکر نے وحدت ادیان کا تصور پیش کیا ہے۔ اس حلقے کے کچھ مفکرین نے مغرب اور فلسفہ مغرب پر تنقید بھی کی ہے لیکن بعض مقامات پر اسلامی علمیات اور عقائد سے متعلق بنیادی معاملات میں ٹھوکریں کھائیں۔

یورپ اور امریکہ میں جدیدیت کو فروغ دینے والے مسلم اسکالرز میں ڈاکٹر فضل الرحمن، ڈاکٹر سید نعمان الحق، ڈاکٹر اقبال احمد، ڈاکٹر ممتاز احمد، ڈاکٹر رفعت حسین، ضیاء الدین سردار، فرید زکریا، نیویارک سٹی کی مسجد الفرح کے امام فیصل عبد الرؤف، شیخ عبد الحکیم مراد و دیگر شامل ہیں۔ (جاری ہے)

مطالعۂ کتاب سید خالد جامعی

البرہان جون ۲۰۲۱ء پر تبصرہ

* برادرم ڈاکٹر محمد امین صاحب!

جون ۲۰۲۱ء کے البرہان میں آپ کے مضمون ''میں نے زندگی سے کیا سیکھا'' میں ایک فاش غلطی ہے جس کی طرف توجہ مبذول کرانا چاہتا ہوں۔ آپ نے لکھا ہے کہ میں نے جماعت اسلامی میں ایک ہی صوفی دیکھا ہے ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت صاحب۔لیکن آپ کے مضمون سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جماعت اسلامی میں دو صوفی تھے۔ایک صوفی جماعت میں شامل ہوئے لیکن پھر الگ ہوگئے دوسرے صوفی ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب آخر وقت تک جماعت اسلامی میں رہے۔ جماعت کے پہلے صوفی انٹر کامرس کے زمانے میں ہی تصوف کی راہ کے مسافر تھے۔ان محترم صوفی نے اپنی بھابھی سے وہی الفاظ کہے تھے جو الفاظ جماعت اسلامی کے صوفی ڈاکٹر عبدالقیوم نے ڈاکٹر محمد امین سے کہے تھے۔ڈاکٹر عبدالقیوم صاحب نے ڈاکٹر امین سے کہا ''تم خدا سے اپنی مرضی کے نتائج لینے پر اصرار کرتے ہو۔اس کے بجائے یہ کیوں نہیں کرتے کہ اس کی رضا پر اور فیصلوں پر راضی رہو''۔ڈاکٹر محمد امین نے یہی الفاظ انٹر کامرس میں اپنی بھابھی کے یہاں پانچویں بیٹی کی ولادت پر ان کی آزردگی کے خاتمے کے لیے کہے تھے کہ ''بھابھی آپ بیٹے کی آس چھوڑ دیں بیٹے کی توقع نہ کریں۔ بلکہ اللہ سے بیٹے کی دعا مانگنا بھی چھوڑ دیں اور یہ کہا کریں کہ اے اللہ میں آپ کی مشیت اور آپ کے فیصلوں پر راضی ہوں۔آپ میری اولاد کے بارے میں جو بھی فیصلہ کریں میں اس پر خوش ہوں'' (البرہان،ص:۴۳)اس تفصیل کا مقصد یہ واضح کرنا تھا کہ جماعت اسلامی کے پہلے صوفی ڈاکٹر امین تھے اور دوسرے ڈاکٹر عبدالقیوم سعادت مرحوم۔

* راقم کی نظر میں پاکستانی آئین میں مساوات کا اصول مغرب کے عقیدہ مساوات سے لیا گیا ہے جس کے مطابق حق و باطل میں کوئی فرق نہیں۔کافر اور مسلم جو شخص بھی کسی ریاست کا شہری (Citizen) ہے صرف وہی انسان (Human) کہلانے کا مستحق ہے اور انسانی حقوق

صرف اسی کو ملیں گے جو کسی ریاست کا شہری ہو۔ظاہر ہے یہ اصول اسلامی علمیت کے منافی ہیں۔ اسلام میں کافر اور مسلم،مسلم اور اہل کتاب،مسلم اور اہل ذمہ،مشرک،حربی،معاہد کی اصطلاحات استعمال ہوتی ہیں کیونکہ کافر کسی حال میں مسلم کے برابر نہیں ہوسکتا۔حق اور باطل مساوی نہیں ہوسکتے لیکن البرہان کے صفحہ ۱۷ پر اسلامی قدر یہ بتائی گئی ہے کہ یکساں سلوک بمقابلہ امتیازی سلوک (البرہان،ص:۱۷) سوال یہ ہے کہ سورہ توبہ میں کیا یکساں سلوک کا حکم دیا گیا ہے؟ اہل کتاب اور مشرکین سے الگ الگ سلوک کیا گیا جو رسالت مآب کے حکم کے تحت جزیرہ العرب سے تمام اہل کتاب کو حضرت عمر کے دور میں نکال دیا گیا کہ قیامت تک جزیرہ العرب میں غیر مسلم مقیم نہیں ہوسکتا۔اسلام تو مسلم اور کفار سے یکساں سلوک کی اجازت نہیں دیتا۔

* راقم کا سوال یہ ہے کہ کیا اسلامی امارت میں کوئی کافر عدالت کا چیف جسٹس، اعلیٰ ترین عہدے پر فائز اور فوج کا کمانڈر چیف ہوسکتا ہے؟ پاکستانی آئین کے تحت صرف صدر اور وزیر اعظم کے لیے مسلم کی شرط ہے چیف جسٹس، بیوروکریٹ اور قوم کے سربراہ کے لیے مسلم کی شرط نہیں۔پہلی شرط مساوات کے اصول کے خلاف ہے جسے البرہان میں اسلامی قدر لکھا گیا ہے۔ دوسری شرط اسلامی امارت کے اصولوں کے خلاف ہے لیکن البرہان میں یہ بھی لکھا گیا ہے کہ پاکستان میں غیر مسلم اہل کاروں کے اپنے فرائض منصبی سے انصاف کی وجہ یہ تھی کہ انہوں نے اسلامی تعلیمات حاصل کیں اور اسلامی معاشرے کی ضروریات کا فہم رکھا۔اس سلسلے میں جسٹس اے آر کارنیلس اور جسٹس بھگوان داس کی روشن مثالیں ہیں۔کیا اسلامی امارت میں چیف جسٹس غیر مسلم، قادیانی، کافر ہوسکتا ہے؟ یہ ایک اہم سوال ہے۔

* محترم مدیر کی جانب سے مجمع العلوم الاسلامیہ کی حمایت کا اعلان (البرہان،ص:۲۴) مدیر صاحب کے اس مؤقف کے برعکس ہے جو صفحہ ۲۲ پر بیان کیا گیا ہے کہ حکومت پرانے وفاقوں کی اجارہ داری توڑنا چاہتی ہے تاکہ ان سے اپنی مرضی کی شرائط منوائی جائیں۔ نئے وفاقوں کو منظوری وہ اسی شرط پر دے رہی ہے کہ وہ حکومتی مؤقف کے آگے فرمانبردارانہ رویہ اختیار کریں(البرہان،ص:۲۲)۔

سوال یہ ہے کہ حکومت کے آلہ کار، پٹھوؤں، فرمانبرداروں کے وفاق کی حمایت کا کیا جواز ہے؟ پرانے وفاقوں کی اجارہ داری توڑنے کا مقصد ریاستی اور عالمی ایجنڈے کی تکمیل ہے تو ہمیں پرانے وفاقوں کی حمایت کرنی چاہیے یا سرکاری گماشتوں کی؟ آپ نے خود صفحہ ۲۲ پر لکھا ہے کہ حکومت کو دینی تعلیم یا اس کی بہتری سے کوئی دلچسپی نہیں ہے جس حکومت کو دین سے محبت نہیں وہ نئے وفاق کیوں قائم کرا رہی ہے؟ سوال یہ بھی ہے کہ ۱۹۸۳ء سے لے کر ۱۹۸۷ء تک صرف پانچ وفاق قائم ہوئے لیکن ۲۰۲۱ء میں دس وفاق ریاست کے ایک اشارے پر کھمبیوں کی طرح اگ آئے۔ ایسے وفاقوں کی حمایت آپ کی جانب سے حیرت انگیز ہے۔

* اقامت دین اور غلبۂ دین کی بحث میں چند اہم عنوانات کو شامل کرنا ضروری ہے۔ عالمی اسلامی انقلابی احیائی تحریکوں پر ان کے ناقدین کا سب سے بڑا اعتراض یہ ہے کہ وہ باطل کو، ریاست کے اقتدار کو چیلنج کرتی ہیں، ان کی حریف بنتی ہیں جس کے نتیجے میں تشدد، ناکامی اور اشتعال جنم لیتا ہے۔ مثبت کام کرنے کے مواقع ختم ہوجاتے ہیں۔ لہٰذا ان جماعتوں کو تبلیغی جماعت کی طرح پرامن حکمت عملی اختیار کرنا چاہیے۔ چیلنج کرنے والی حکمت عملی درست نہیں؟ یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ نے چیلنج کرنے والی حکمت عملی کیوں اختیار کی جب کہ وہ تنہا تھے؟ یہاں تو مذہبی تحریکوں کے پیچھے لاکھوں لوگوں کی حمایت موجود ہے؟ اس صورت میں ریاست وحکومت کو حربی، عسکری، سیاسی طریقوں سے کیوں چیلنج نہ کیا جائے؟ دوسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ انبیاء جنہوں نے چیلنج دینے کے بجائے صرف دعوت دین کا کام کیا، پرامن طریقے سے اپنی بات کفار ومشرکین تک پہنچائی ان کے ساتھ ان کی قوم نے کیا سلوک کیا؟ قرآن بتاتا ہے کہ ان کی قوم نے کہا: تم ہماری بستی میں اکیلے ہی پاک باز ہو؟ ان کی قوم نے کہا کہ تم ہماری ملت میں واپس آجاؤ ورنہ ہم تمہیں رجم کردیں گے۔ حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت لوطؑ سب دعوت دین کا کام کررہے تھے مگر اس کام کو نظام کفر نے اپنے لیے چیلنج سمجھا اور پرامن دعوت کے جواب میں ان کو ختم کرنے اور مٹانے کی دھمکی دی۔ ایک اور مثال اصحاب کہف اور اصحاب الاخدود کی ہے۔ انہوں نے کب نظام موجود کو چیلنج دیا تھا؟ وہ تو صرف

اپنے دین کو چھوڑنے پر تیار نہ تھے لیکن نظام کفر نے انہیں اپنے لیے چیلنج سمجھا۔ حضرت موسیٰ اور ہارون نے فرعون کے دربار میں دعوت دین دی تو جواب ملا یہ اشخاص ہمارے شاندار نظام زندگی کو ختم کر کے اپنا اقتدار قائم کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن کی روشنی میں ان نصوص کی کیا تشریح ہوگی؟ ان عنوانات پر مکالمے کی ضرورت ہے۔

* تبلیغی جماعت دین کی کلیت کا تو انکار نہیں کرتی لیکن دین کے صرف ایک اہم جز و کو اپنی جدوجہد کا محور بناتی ہے۔ ظاہر ہے ہر تحریک اپنے لیے دین کے کسی ایک جز و کو اختیار کرتی ہے۔ کوئی شخص تمام زندگی صرف نورانی قاعدہ پڑھاتا رہے یا حدیث کا درس دیتا رہے یا قرآن کی تدریس میں مشغول رہے تو اس سے یہ نتیجہ اخذ نہیں کیا جاسکتا کہ یہ سب جہاد کے منکر ہیں (نعوذ باللہ) اور باطل کو چیلنج نہیں کر رہے۔ ہر نقطۂ نظر اور کام اپنی جگہ نظام کفر کے خلاف مجاہدین تیار کر رہا ہے۔ ایک زمانہ تھا کہ تبلیغی جماعت کو روس اور چین تک رسائی حاصل تھی لیکن آج تبلیغی جماعت روس اور چین میں داخل نہیں ہو سکتی شیریں ہنٹر نے اپنی کتاب ''The Voices of Islam'' میں لکھا ہے کہ تبلیغی جماعت جہادی تحریکوں کی نرسری ہے کیونکہ یہ جماعت لوگوں کو مسجد تک لاتی ہے۔ مذہبی بناتی ہے اور جہادی تحریکیں انہیں اُچک لیتی ہیں۔ تبلیغی جماعت اور دعوت اسلامی بھی نظام کفر کی نظر میں اسلامی علمیت کی کلیت کے مظاہر ہیں اور ناقابل قبول ہیں۔ ان حالات میں اسلامی تحریکیں کیا کریں؟

البرہان:

جامعی صاحب کی تحریر ہمیں اس دن ملی جب پرچہ پریس جا رہا تھا اس لیے اس پر کوئی ردّ عمل دینا ممکن نہ تھا۔

مطالعۂ کتاب ڈاکٹر انوار احمد بگوی

مسلک پرستی اور فرقہ واریت سے کیسے بچا جائے؟

'آدابِ اختلاف اور اتحادِ امت'

از ڈاکٹر اختر حسین عزمی

فروعی اور فقہی اختلافات کے موضوع پر گاہے بگاہے ایک آدھ تحریر سامنے آتی رہتی ہے لیکن اس پر بطور جامع موضوع اور ایک واضح مقصد کے تحت باقاعدہ کتاب کی ضرورت تھی تا کہ اس سلسلے کے سارے پہلوؤں کو ایک ساتھ رکھا جائے۔ کتاب نیک نیتی اور اخلاص سے لکھی جائے تا کہ ہر مکتب فکر اسے پڑھ سکے۔

علمی اور مذہبی حلقوں میں ڈاکٹر اختر حسین عزمی اب ایک ثقہ نام ہے۔ وہ گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ لاہور میں صدر شعبہ علوم اسلامی ہیں۔ ان کی تازہ ترین اور ضخیم تصنیف ''آدابِ اختلاف اور اتحادِ امت'' ہے۔ یہ موضوع بلاشبہ آج وقت کا اہم تقاضا ہے اور یہ پاکستان اور اس میں بسنے والے مسلمانوں کی ضرورت ہے۔

ڈاکٹر عزمی کی کتاب پانچ ابواب اور ۲۷ فصلوں پر مبنی ہے۔ ابواب کے عنوانات یہ ہیں:

۱۔ فرقہ پرستی کے نقصانات

۲۔ آداب اختلاف

۳۔ حقیقت اختلاف ورواداری

۴۔ شیعہ سنی اختلاف

۵۔ علاج

۱۔ ڈاکٹر عزمی کی کتاب ''آداب اختلاف اور اتحاد امت'' کا عنوان ہی بہت مثبت اور مؤثر ہے۔ یعنی علماء کے درمیان باہم اختلاف رائے ہے کوئی مخالفت یا مخاصمت کا مسئلہ نہیں ہے۔ اختلاف رائے انسانی معاشرے کا حسن ہے البتہ اختلاف میں آداب کا رواج اتحاد امت کا

باعث بنے گا۔

۲۔ حالات واقعات کا تجزیہ علمی ہے۔اس میں کوئی لاگ یا یک طرفہ جھکاؤ نظر نہیں آتا چنانچہ کہیں بھی مصنف کی طرف داری یا یک رُخی محسوس نہیں ہوتی۔

۳۔ کتاب کی زبان شائستہ اور اسلوب شستہ ہے۔کہیں بھی طنز و تعریض یا نکتہ چینی نہیں کی گئی۔

۴۔ مصنف کی دل سوزی سطر سطر سے نمایاں ہے۔وہ اخلاص سے چاہتے ہیں کہ دین کی سرفرازی کے لیے تمام علماء مل کر کام کریں۔

۵۔ کتاب میں مختلف فرقوں کے مؤقف یا نظریات پر بحث نہیں کی گئی کہ کون صحیح ہے اور کس نے کہاں خطا کی ہے۔ چنانچہ ایسی کتاب ہر طبقے کے لیے قابل برداشت اور لائق مطالعہ ہے۔

۶۔ تمام فرقوں کے اکابرین کا ذکر عزت اور تکریم سے کیا گیا ہے۔

۷۔ ذاتی اور اجتماعی واقعات نے موضوع کو نظری کے ساتھ ساتھ عملی (Applied) بھی بنادیا ہے جو کتاب کا اصل مقصد ہے۔

۸۔ کتاب کی ضخامت کم ہونی چاہیے۔آج کل بڑی کتابیں پڑھنے کا رجحان کم ہو گیا ہے۔ چونکہ اس کتاب کو تمام علمی اور مذہبی حلقوں میں جانا چاہیے اس لیے کتابیات سے افادیت بڑھ جاتی، آئندہ ایڈیشن میں اضافہ ضروری ہے۔

۹۔ اسلامک پبلی کیشنز لاہور نے ۴۹۶ صفحات کی کتاب بہت نفاست سے شائع کی ہے۔

۱۰۔ بلا شبہ ''آداب اختلاف اور اتحاد امت'' مسلمان فرقوں کے درمیان اتفاق اور رواداری پیدا کرنے کی بہت اعلیٰ اور مفید کوشش ہے۔

ڈاکٹر عزمی نے ''علاج'' کے تحت بہت عمدہ بحث کی ہے۔ یہ درست ہے کہ دینی جماعتوں یا مذہبی فرقوں کو شاہ ولی اللہ دہلوی جیسی وسعت نظر پیدا کرنی چاہیے۔ ایک اختلاف تو جماعتوں کے اکابرین کی تحریروں کا ہے اس میں تفردات (Exceptions) کو سمجھنے اور برداشت کرنے کی

ضرورت ہے۔ دوسرا اختلاف بعض مظاہر (Manifestations) کا ہے جو ایک دوسرے کے لیے ناقابل برداشت اور لائق تنقید ہوتے ہیں۔ اگر یہ بات مان لی جائے کہ ہر مذہبی جماعت اسلام اور مسلمانوں کے لیے جو بھی کام کر رہی ہے اس میں نیک نیتی کے ساتھ کچھ بھلا یعنی خیر بھی موجود ہے۔ تو تمام مکاتب فکر کے اہل علم کو امت کا مشترکہ اثاثہ سمجھا جا سکتا ہے۔ پھر علماء کی اجتماعی قوت امت مسلمہ کی فلاح اور اسلام کے دفاع کے لیے زیادہ مؤثر ثابت ہوگی۔

''علاج'' کے مختلف طریقے ہیں جنہیں ڈاکٹر عزمی نے بطور ''معالج'' استعمال کیا ہے۔

- کتاب پر مختلف مکاتب فکر کے علما نے بڑی شاندار تقاریظ لکھی ہیں۔ بہت مناسب ہوتا بلکہ بارش کا پہلا قطرہ ہوتا اگر وہ ان تحریروں کو اپنے اپنے حلقوں میں پھیلائیں اور اپنے رسالوں میں چھاپ دیں۔ اور اپنے طلبہ اور متوسلین کو اظہار خیال کی دعوت دیں۔

- باہمی اختلاف کے سد باب کے لیے اعتدال اور اتحاد بین المسلمین کو بطور مضمون دینی مدرسوں میں پڑھایا جائے۔

''آداب اختلاف اور اتحاد امت'' اور اس جیسی دوسری کتابوں کو ہم نصابی قرار دیا جائے۔

- ملک میں اگر کوئی ایسا مدرسہ، منبر، مسجد یا رسالہ رہ گیا ہے جو اعتدال، رواداری اور اتحاد بین المسلمین کی پالیسی پر کاربند ہے تو تمام جماعتوں کی طرف سے اس کی سرپرستی کی جائے اور اس کے کاموں کو سراہا جائے اور اس کی حوصلہ شکنی نہ کی جائے۔

افغانستان کا مسئلہ

الحمدللہ! طالبان افغانستان کے ۲۰ سالہ جہاد کی وجہ سے سارے عالم کفر کی مجموعی قوت (امریکہ و یورپ) کو شکست ہوئی۔ افغان طالبان اور امت مسلمہ کو مبارکباد! اللہ کرے جلد ساری رکاوٹیں دور ہوں اور افغان طالبان کی امارت اسلامیہ کام شروع کر دے۔ ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾

پاکستان کا مفاد بھی اسی میں ہے کہ وہ طالبان کی حمایت کرے، امریکہ کے مطالبوں کے جال میں نہ پھنسے اور نہ بالواسطہ بھارت کی حوصلہ افزائی کا سبب بنے۔

یادرفتگان مدیر

راہِ خلد بریں چلے۔علامہ محمد خلیل الرحمن قادریؒ

میرے دوست اور ملی مجلس شرعی کے نائب ناظم اعلیٰ علامہ محمد خلیل الرحمن قادری ۲ جون ۲۰۲۱ءکو عازم خلد بریں ہوئے۔انا للہ وانا الیہ راجعون

راقم یہ کہتے ہوئے نہیں شرماتا کہ جب تک اسے ملی مجلس شرعی میں ڈاکٹر سرفراز نعیمی شہیدؒ، مولانا مفتی محمد خاں قادریؒ اور علامہ محمد خلیل الرحمن قادریؒ کے ساتھ کام کرنے کا موقع نہیں ملا تھا اس کی رائے بریلوی علماء کے بارے میں یہ تھی کہ یہ لوگ جمود پرست اور متشدد ہوتے ہیں اور ان کے ساتھ مل کر کام کرنا بہت مشکل ہوتا ہے لیکن تجربے کے بعد میری یہ رائے بدل گئی کیونکہ میں نے ان تینوں کو بہت وسیع القلب اور بہت وسیع الظرف پایا۔

علامہ محمد خلیل الرحمٰن قادری مرحوم دنیوی و دینی دونوں علوم سے بہرہ ور تھے۔مزید مفتی محمد خاں قادریؒ کی طویل برسوں کی ہم نشینی، اکٹھے مل کر کام کرنے اور خود ان کا ذوق اور محنت، ان سب چیزوں نے مل کر انہیں ایسا محقق بنا دیا تھا جو نہ صرف عربی ماخذ تک بآسانی دسترس رکھتا تھا بلکہ جدید علوم اور حالات پر بھی ان کی گہری نظر تھی۔ممتاز قادری شہید کیس میں انہوں نے مفتی صاحب سے مل کر شہید کے وکیل جسٹس میاں نذیر اختر سے نہ صرف بھرپور تعاون کیا بلکہ سچی بات یہ ہے کہ جسٹس صاحب کو اکثر و بیشتر مواد انہی کا فراہم کردہ تھا۔اور جب جسٹس صاحب شہید کا کیس بدقسمت حکمرانوں اور ججوں کی وجہ سے ہار گئے تو بھی خلیل صاحب اور مفتی صاحب نے ہار نہیں مانی اور اس وقت کے وزیراعظم اور آرمی چیف تک ذاتی رسائی حاصل کر کے ان تک اپیل بھجوائی کہ وہ یہ سیاہ دھبہ اپنی ذات پر نہ لگوائیں لیکن تقدیر کو کون ٹال سکتا ہے؟ علامہ خلیل الرحمٰن مرحوم نے نچلی اور بڑی عدالتوں کے فیصلوں پر سیر حاصل تبصرہ و نقد کیا اور اپنی صلاحیتوں کا لوہا منوایا۔

ان میں عفو و درگزر کی خوبی بہت تھی۔میں نے کئی دفعہ ان سے تفصیلات جاننا چاہیں کہ وہ اور مفتی صاحب، ڈاکٹر طاہر القادری صاحب سے کیوں الگ ہوئے؟ لیکن انہوں نے ہر دفعہ اس کے جواب سے گریز کیا اور کہا چھوڑیے ڈاکٹر صاحب! رات گئی بات گئی اور کبھی بھی ڈاکٹر طاہر القادری صاحب یا ادارہ منہاج القرآن کے بارے میں منفی تبصرہ نہ کیا۔ملی مجلس شرعی میں وہ مفتی صاحب کے مددگار اور میرے مخلص اور محنتی ساتھی تھے۔اللہ تعالیٰ ان کو جنت الفردوس میں جگہ دیں اور مفتی صاحب کے ساتھ ان کی جوڑی جس طرح یہاں تھی وہاں بھی قائم رہے۔آمین یارب العالمین۔

استفسارات مدیر

مولانا وحیدالدین خاں کی فکر

مستفسر: آپ نے البرہان کے پچھلے ماہ کے شمارے میں مولانا وحیدالدین خاں کی فکر پر شاہنواز فاروقی صاحب کی تنقید کو ناپسند کیا ہے۔کیا اس کا مطلب یہ لیا جا سکتا ہے کہ آپ مولانا وحیدالدین خاں کی آراء کو صحیح سمجھتے ہیں؟

مدیر: ہرگز نہیں! مَیں نے یہ تاثر کہیں نہیں دیا اور نہ میں نے ایسی بات کبھی کہی یا لکھی ہے۔

مولانا وحیدالدین خاں نے جماعت اسلامی کو چھوڑا تو ابتداءً ان کا مؤقف یہ تھا کہ مولانا مودودی کی فکر میں دین میں سیاست وریاست کی اہمیت اور کردار کو مبالغے کے ساتھ پیش کیا گیا ہے۔اور یہ کہ اس کے لیے انہوں نے قرآن وسنت کی نصوص اور دینی تصورات کی جو تاویل کی ہے وہ مخدوش ہے اور ایک لحاظ سے اسے دین کی سیاسی تعبیر کہا جا سکتا ہے۔

راقم الحروف یہ سمجھتا ہے کہ یہاں تک ان کی بات میں وزن تھا لیکن وہ یہاں رکے نہیں بلکہ دوسری انتہاء تک چلے گئے۔انہوں نے تجدد اور مغرب پرستی کی روش اختیار کر لی اور مغرب کے سیکولرزم کو قبول کر لیا۔دین میں سیاست وریاست کی اہمیت اور کردار کی نفی کی۔جہاد کا بھی انکار کیا۔مغرب اور ہندو کی اسلام دشمنی کی حمایت کی۔اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے سنت جیسے بنیادی ماخذ دین کا استخفاف وانکار کیا اور اجماع وجمہور علماء کی آراء کو اہمیت نہ دینے کی روش اختیار کی۔مولانا وحیدالدین خاں (اور ان کے متبع جاوید احمد غامدی صاحب) کی یہ آراء بداہتًا غلط ہیں۔مغربی تہذیب کفر پر مبنی ہے۔یہ دین ماسوی اللہ ہے۔مولانا وحیدالدین خاں اور جاوید احمد غامدی اسلام کا مغربی (امریکی) ایڈیشن پیش کر رہے ہیں جو حقیقی دین سے دور اور مغرب کی فکری وعملی غلامی تک لے جانے والا ہے۔یہ گمراہی ہے اور قابل ردّ ہے۔

جو اہل علم اور دانشور مولانا مودودی کی فکر کو سو فیصد صحیح سمجھتے ہیں،انہیں حق حاصل ہے کہ وہ اپنے مؤقف کی حمایت ومدافعت کریں اور اس کے لیے دلائل دیں۔مَیں نے پچھلے شمارے میں شاہنواز فاروقی صاحب کی تحریر کے حوالے سے اُن سے صرف یہ استدعا کی تھی کہ انہیں کسی عالم اور دانشور کے مولانا مودودی سے اختلاف کرنے پر مشتعل نہیں ہونا چاہیے اور مشتعل ہو کر بدزبانی پر نہیں اترنا چاہیے اور نہ کسی کی نیت پر حملہ کرنا چاہیے۔

تبصرۂ کتب مدیر

کتاب نما

'یہ ہے مغربی تہذیب' از ڈاکٹر عبدالغنی فاروق

''یہ ہے مغربی تہذیب'' کے علاوہ ہمیں ڈاکٹر عبدالغنی فاروق صاحب کی مغربی تہذیب پر دو اور کتابیں موصول ہوئی ہیں ''مغرب پر اقبال کی تنقید'' اور ''امریکہ اور یورپ میں عورتوں کی حالت زار''۔ ہماری رائے میں مغربی فکر و تہذیب ہمارے عہد کا سب سے بڑا فتنہ ہے اور مسلم معاشرے کے لیے سب سے بڑا چیلنج بھی۔ افسوس اس بات کا ہے کہ مغرب کی سوڈیڑھ سال کی غلامی نے مسلم معاشرے کے اکثر طبقات کو مغرب کا فکری اور عملی غلام بنا دیا ہے اور صرف کچھ ہی ایسے سلیم الفطرت دانشور بچے ہیں جو مغربی فکر کے الحاد، بے دینی اور مادہ پرستی کی حقیقت کو سمجھتے ہیں اور اسلامی نقطۂ نظر سے اس کا رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مغرب کی صحیح تفہیم کے لیے ڈاکٹر صاحب کی ان تینوں کتابوں کا مطالعہ بہت مفید ہے خصوصاً نوجوانوں کو ان کا مطالعہ ضرور کرنا چاہیے۔ یہ تینوں کتابیں، کتاب سرائے اردو بازار لاہور (042-37320318) اور فضلی بک سپر مارکیٹ، اردو بازار کراچی (021-32212991) سے حاصل کی جاسکتی ہیں۔

یادداشت پارلیمانی معرکہ اسلام وقادیانیت از مولانا حکیم عبدالرحیم اشرفؒ

فیصل آباد کے ڈاکٹر زاہد اشرف صاحب اپنے والد گرامی کے کام کو نئے سرے سے مرتب کر کے اچھے انداز میں پبلک کے سامنے لا رہے ہیں۔ یہ کتاب اس یادداشت پر مشتمل ہے جو قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کے لیے حکیم صاحب نے ارکان قومی اسمبلی کے لیے تیار کی تھی اور ارکان کی ذہن سازی میں اس نے اہم کردار ادا کیا اور اس کے نتیجے میں ستمبر ۱۹۷۴ء میں قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دینے کا تاریخی فیصلہ کیا۔ یہ کتاب بھی کتاب سرائے لاہور اور فضلی بک سپر مارکیٹ کراچی سے مل سکتی ہے۔

درر فرائد ترجمہ جمع الفوائد اردو ترجمہ مولانا عاشق الٰہی میرٹھیؒ

یہ گیارھویں صدی ہجری کے ایک عظیم محدث و مصلح محمد بن سلیمان المغربی المالکی کی تالیف ہے جو مناقب صحابہ اور کتاب الزہد والرقاق وغیرہ پر مشتمل ہے۔ یہ اصل کتاب کی پانچویں جلد ہے۔ مولانا عبدالقیوم حقانی صاحب کو اللہ تعالیٰ صحت و توانائی سے نوازیں۔ انہوں نے اتنے محاذ سنبھالے ہوئے ہیں کہ کئی ادارے مل کر بھی اتنا کام نہیں کر سکتے جتنے وہ القاسم اکیڈمی اور جامعہ ابی ہریرہ میں بیٹھ کر کر رہے ہیں۔ کتاب القاسم اکیڈمی، جامعہ ابی ہریرہ، خالق آباد نوشہرہ، خیبر پی کے (0301-3019928) سے حاصل کی جاسکتی ہے۔

شمع جلتی رہے

البرہان محض ایک جریدہ نہیں ایک مشن ہے۔ اگر آپ کو اس کے مضامین سے دلچسپی ہے تو کوشش کیجیے کہ یہ شمع جلتی رہے اور یہ شمع تبھی جلتی رہے گی جب آپ اس میں اپنے حصے کا تیل ڈالتے رہیں گے۔ خود بھی البرہان کے خریدار بنئے اور دوسروں کو بھی بنائیے۔

زرِاعانت: سالانہ 500روپے پانچ سال:2000روپے تاحیات:10,000روپے

نام.................................. پتہ..................................

فون..................................

چیک اور منی آرڈر بنام تحریک اصلاح تعلیم ٹرسٹ A-97 نیلم بلاک، اقبال ٹاؤن، لاہور بھجوائیے

ٹرسٹ کو دیے جانے والے عطیات ٹیکس سے مستثنیٰ ہیں

CPL No. 296 July 2021

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

عصری تعلیم کی اصلاح

	قیمت
ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۶۰۰
اسلامی سکول کے خدوخال	۱۵۰
تعلیم اور اس کا اسلامی کردار	۳۰۰
یکساں قومی نصاب۔ خدشات و مضمرات	۲۵۰
تدریس القرآن ① برائے معلمین (ڈاک خرچ)	۵۰
تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات (ڈاک خرچ)	۵۰
پنج سورہ (اُردو تفہیم) (ڈاک خرچ)	۵۰
ایک نئی یونیورسٹی کی ضرورت (زیرطبع)	

طلبہ کی اسلامی تربیت

تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۲۵۰
تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک وگائیڈ	۳۰۰

اصلاحِ دینی مدارس

ہمارا دینی نظام تعلیم	۴۵۰
نصابِ مدنیؒ	۸۰
مدرسہ ڈسکورسز۔ مطالعہ و تجزیہ	۲۵۰
اصلاحِ دینی مدارس	۴۰۰

اسلامی تحریکیں

پاکستان کی دینی قوتیں غیر مؤثر اور ناکام کیوں؟	۳۰۰

	قیمت
ایک نئی ہمہ جہت اصلاحی تحریک کی ضرورت (ڈاک خرچ)	۴۰
خاموش انقلاب۔ ناگزیر ہے	۳۵۰
عصر حاضر میں دین کا متوازن تصور	۱۵۰

تزکیۂ نفس

اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۱۵۰۰
حقیقت تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۸۰
اپنی اصلاح آپ کیسے؟	۸۰
ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۳۵۰
اسلام اور تعمیر سیرت (زیرطبع)	

مغربی فکر وتہذیب

اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۳۵۰
اسلام اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۲۵۰
اسلام اور ردِ مغرب	۳۰۰

فہم دین

مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل	۴۷۵
مقالاتِ امین (جلد اوّل)	۱۰۰۰
مقالاتِ امین (جلد دوم)	۱۰۰۰
شاتم رسول کے قتل کی شرعی حیثیت	۵۰

مکتبہ البرہان

15 شیر شاہ بلاک، نیو گارڈن ٹاؤن، لاہور۔ فون 0309-4607124 ای میل ermpak@hotmail.com